قرآن کا دکھ

اسرار ایوب

قرآن کا دکھ

اسرار ایوب

مراسم

"Qur'an Ka Dukh" is an outstanding scholarly work on understanding the message of Qur'an and developing a dynamic personality eager to serve the humanity at large.

The Islamic Society of North America (Canada)

"Qur'an Ka Dukh" is a refreshing approach to the study of the Qur'an. It has been very eloquently argued that the basic problem of the Muslim thought today lies in a reading of Quran that is more loyal to the 'orthodox' understanding of the Islamic tradition, than to its simple meanings. It has been demonstrated how in simple daily matters like prayer, repentance etc, the traditional reading of the Qur'an is hindering the more liberal and dynamic understanding of the Qur'an and social problems. However, revival of Islam still remains an ideal, a dream. This book shows the reason why?

Dr. Muhammad Khalid Masood

Ex. Chairman Council of Islamic Ideology of Pakistan

"Qur'an Ka Dukh" acquaints the reader with the most progressive aspects of Quran and Ahadith, gives light to the reader and opens many more avenues to ruminate and provides food for thought. A real eye opener this book is. With special reference to interpretation of Islam's viewpoint on women's status, I would say that "Qur'an Ka Dukh" should not only be widely publicized but be referred to in the debates.

Justice (Retired) Majida Rizvi

Ex. Chairperson National Commission on the Status of Women

Marasim Publishers

0300-5040433

قرآن کا دُکھ

(فکر و تحقیق)

اسرار ایوب

ضابطہ

جملہ حقوق مصنف محفوظ ہیں۔

نام کتاب	:	قرآن کا دُکھ
مصنف	:	اسرار ایوب
اھتمام	:	سیّد آل عمران
سرورق	:	آغا نثار
اشاعت	:	مارچ 2003ء اوّل
اشاعت سوئم	:	اپریل 2011
تعداد	:	ایک ھزار
قیمت	:	250/-
پبلشرز	:	مراسم (0300-5040433)

رابطہ مصنف : Email:

ayubasrar@yahoo.com

سالارِ حریتِ فکر
محسنِ انسانیت
حضرت محمد ﷺ
کے نام

☆ جنہوں نے قدامت پرستی کا خاتمہ کر کے ایک نیا جہان پیدا کیا

☆ جنہوں نے فرعونیت، قارونیت اور ہامانیت کو دور کر کے دنیا کو سنوارا

☆ جنہوں نے خدا کی حکومت قائم کر کے انسان کو انسان کی محکومیت سے نجات دلائی

ترتیب

ایک چونکا دینے والی کتاب	7
مرحلہء اضطراب	19
کیا دنیا کافروں کے لیے ہے؟	34
کیا عورت مرد سے کم تر ہے	43
دل کے اندھے	56
صرف ایک بات	61
صبر	67
قل العفو	74
دعا	84
سب سے بڑی سنّت	92
خیر و شر	102
استحصالی ٹولہ	111
کیا موت کا ایک وقت مقرر ہے؟	122
ایک عظیم القدر معجزہ	133
مشیت ایزدی	146
توحید کے دشمن	156

ایصالِ ثواب 166
تقدیر 176
طلاق وحلالہ 188
خدا کا تصور 199
توبہ 211
میں آدمی ہوں جس طرح ہوتے ہیں آدمی 219
راہِ گم گشتہ 233
وسیلہ 243
قرآن کا دُکھ 258

قرآن کا دکھ

(ایک چونکا دینے والی کتاب)

کتابیں تو روزانہ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں چھپتی ہیں اور پڑھ کر رکھ دی جاتی ہیں۔ مگر ایسی کوئی کتاب کبھی کبھار ہی ملتی ہے جسے پڑھنے کے بعد انسان چاہتا ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ کو نہاں خانہء قلب و جان میں اتار لیا جائے۔ ''قرآن کا دکھ'' ایسی ہی ایک کتاب ہے جو سامنے آئی تو دل نے چاہا کہ کتاب پڑھنے کی صورت میں مصنف کا جو قرض مجھ پر واجب ہو گیا قلم کے ذریعے اُسے ادا کرنے کی کوشش کروں۔

جو لوگ مجھ سے واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کوئی پیشہ ور تبصرہ نگار نہیں ہوں، میں ہر کتاب کو کڑے تنقیدی انداز سے پڑھتا ہوں اور اگر مجھے کچھ اس پر لکھنا پڑے تو اس احساس ذمہ داری سے لکھتا ہوں کہ:

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر و دیعتِ مژگانِ یار تھا

میں نے ''قرآن کا دکھ'' بھی اسی تنقیدی نکتہء نظر سے پڑھی ہے اور اب پوری دیانت داری سے اپنے تاثرات ضبطِ تحریر میں لانے لگا ہوں۔ ماہر القادری ایک اچھے شاعر تھے، ان کی ایک مشہور نظم ہے ''قرآن کی فریاد''، اس کے دو شعر (پہلا اور آخری) آپ بھی پڑھ لیجئے۔ پوری نظم کا لب لباب آپ کے سامنے آجائے گا۔ ماہر کے الفاظ میں قرآن کہتا

ہے کہ:

آنکھوں سے لگایا جاتا ہوں طاقوں میں سجایا جاتا ہوں
تعویذ بنایا جاتا ہوں دھو دھو کے پلایا جاتا ہوں
کس بزم میں مجھ کو بار نہیں کس عرس میں میری دھوم نہیں
پھر بھی میں اکیلا رہتا ہوں مجھ سا بھی کوئی مظلوم نہیں

بلاشبہ قرآن کی یہ فریاد بھی سچی ہے کہ اس کتابِ ہدایت کے ساتھ یہ ناروا سلوک ہو رہا ہے کہ اس پر عمل کرنے کی بجائے اسے دھو دھو کر پلایا جا رہا ہے اور وہ احمقانہ حرکت کی جا رہی ہے جو کوئی احمق سے احمق مریض بھی کسی ڈاکٹر کے لکھے ہوئے نسخہ کے ساتھ نہیں کرتا ،اس کتابِ نور کے ساتھ یہ ظلم بھی ہو رہا ہے کہ اسے پڑھنے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی بجائے اسے چوم کر اور آنکھوں سے لگا کر طاقچوں میں دھر دیا جاتا ہے کہ اس سے برکتیں حاصل ہوتی رہیں۔

ماہر القادری نے جو کچھ کہا ہے بالعموم سارے مولوی حضرات یہی بات کہتے اور عوام کو مورد الزام ٹھہراتے رہتے ہیں۔مگر ''قرآن کا دکھ'' لکھنے والا مصنف کچھ اور کہنا چاہتا ہے بلکہ کہہ گیا ہے، اُس کا نکتہ ءنظر بہت عمیق اور بہت وسیع ہے، اُس کے نزدیک تو قرآن کا اصل دکھ یہ ہے کہ اسے پڑھنے والوں نے اسے اس طرح نہیں پڑھا جس طرح پڑھنا چاہیے۔

پہلے یہ دیکھیے کہ قرآن کس طرح پڑھا جا رہا ہے۔کچھ لوگ تو وہ ہیں جو سادہ انداز میں ناظرہ قرآن حکیم پڑھتے ہیں یعنی دیکھ کر فر فر پڑھتے جاتے ہیں۔کچھ حفاظ ہیں جنہوں نے قرآن حکیم یاد کر رکھا ہے اور فر فر پڑھ رہے ہیں، کہا جاتا ہے قرآن کا پڑھنا کارِ ثواب ہے۔یقین کیجئے یہ دنیا کی پہلی اور آخری کتاب ہے جو معانی جانے بغیر پڑھی جاتی ہے وگرنہ کتاب تو کجا کسی کے پاس ایک چند سطروں کی چھٹی بھی آتی ہے تو وہ بھی اس زبان کو سمجھنے

والے تلاش کرتا ہے جس زبان میں چھٹی لکھی ہوئی ہے اور جب تک چھٹی کا مفہوم سمجھ کر اطمینا ن نہیں کر لیتا چین سے نہیں بیٹھتا۔ مگر خدا کی یہ عظیم کتاب صدیوں سے بغیر معانی سمجھے پڑھی جا رہی ہے اور لوگ مطمئن ہیں کہ انہیں ثواب مل رہا ہے۔

قرآن پڑھنے والا ایک اور طبقہ ہے۔ جس میں شامل حضرات کو قاری کہتے ہیں ،قرأت ایک الگ فن ہو گیا ہے ''ع'' حلق کے کسی کونے سے نکالتی ہے ''ق'' اور ''ک'' کا فرق کیسے ملحوظِ ادائیگی رکھنا ہے ''ز''، ''ظ'' اور ''ض'' میں زبان کو کیسے حرکت دینی ہے، یہ قاری حضرات کا کام ہے، پھر قرأت کے مختلف طریقے ہیں جن کے ساتھ خوش الحانی شامل کی جاتی ہیں۔

یہ قاری حضرات کیا کرتے ہیں؟ اس کے متعلق ہم اپنی طرف سے کچھ کہیں گے تو علماء کی طرف سے جانے ہم پر کیا فتوے داغے جائیں اسلئے ہم کچھ نہیں کہتے ہاں انہی حضرات میں سے ایک مشہور عالم دین مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے الفاظ نقل کیے دیتے ہیں۔ مولانا ندوہ کے فاضل اور جماعتِ اسلامی سے وابستگی رکھنے والے مقتدر عالم دین تھے اور جماعت اسلامی کو ان کی عربی دانی پر ناز تھا۔ مولانا مرحوم کو مکہ مکرمہ کی ایک مجلس قرأت میں شرکت کرنے کا اتفاق ہوا۔ وہ اس مجلس کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''تلاوت کرنے والے صاحب تلاوت نہیں کر رہے بلکہ کرتب اور فن دکھا رہے ہیں، ایک ایک آیت کو پانچ پانچ چھ چھ طریقوں سے پڑھنا فن دانی کے اظہار کیلئے مناسب ہو تو ہو لیکن تذکر و ہدایت کیلئے جو کتاب اتاری گئی تھی اس کے ساتھ ہمارے قراء کا یہ سرکس کے کھلاڑیوں کا سا برتاؤ حد درجہ افسوسناک ہے۔ راقم کو اس منظر سے سخت اذیت پہنچی''
>
> (دیارِ عرب میں چند ماہ از مولانا مسعود عالم ندوی صفحہ 244)۔

ان قرآن پڑھنے والوں کے بعد اب وہ طبقہ آجاتا ہے جن کا دعویٰ ہے کہ وہ قرآن کو سمجھ کر پڑھتے ہیں ۔ یہ طبقہ ءِ علماء وفضلا ہے، ان حضرات کے تمام تر احترام کے باوجود ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ انہوں نے قرآن کو اس طرح نہیں پڑھا اور نہ ہی سمجھا ہے جیسا کہ اس کتاب عظیم کو پڑھنے اور سمجھنے کا حق تھا۔

قرآنِ حکیم عربی ءمبین میں نازل ہوا، دینا کی چھوٹی بڑی ہر زبان میں بیان کی دوصورتیں ہوتی ہیں۔ایک حقیقت اور دوسری مجاز،علم بیان کا بنیادی اصول ہے کہ ''المجاز ابلغ من التصریح ''(مجازی انداز حقیقت سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے)۔اسے ایک مثال سے واضح کیا کرتے ہیں۔میر تقی میر کا شعر ہے کہ:

ہم کو غیروں سے پھر ہو کیا شکوہ
جبکہ اپنے ہی نا آشنا ٹھہرے

چونکہ ہر آدمی کا یہی تجربہ ہے اسلئے شعر دل پر اثر تو کرتا ہے مگر اندازِ بیان حقیقت کا ہے اسلئے زیادہ مبلغ نہیں،اسی خیال کو ثاقب لکھنوی مجازی انداز میں یوں ادا کرتا ہے کہ:

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

یہ شعر تڑپا دیتا ہے کیونکہ اندازِ بیان مجاز کے رنگ میں ہے ۔محاورہ ، تلمیح ،تشبیہ، استعارہ ، کنایہ یہ سب مجاز کی مختلف صورتیں ہیں ۔مجاز ہیں االفاظ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال نہیں ہوتے مثال کے طور پر ایک محاورہ ہے ''وہ باغ باغ ہوگیا'' اسی کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ ایک آدمی باغ بن گیا ،اس میں پیڑ اور گل بوٹے اُگ آئے؟ نہیں، باغ کا لفظ یہاں اپنے حقیقی معنوں میں استعمال نہیں ہوا اور کیونکہ لفظ حقیقی معنوں میں استعمال نہیں ہوا لہذا اس کا دوسری زبان میں لفظی ترجمہ کرنا بھی غلط ہوگا ۔ جو شخص ''وہ باغ باغ ہوگیا'' کو

انگریزی میں He became garden and garden لکھے گا احمق سمجھا جائیگا۔ قرآن انتہائی فصیح وبلیغ زبان میں نازل ہوا، اس میں محاورات ہیں اور دیگر تمام مجاز کے اسلوب ہیں مگر ترجمہ قرآن لکھنے والے لفظی ترجمہ کرتے چلے جاتے ہیں کہیں کسی محاورہ وغیرہ کی نشاندہی نہیں کی گئی۔

دنیا کی اور زبانوں میں بھی شاید یہ بات ہو مگر میری معلوم زبانوں میں سے صرف انگریزی اور عربی میں یہ خصوصیت ہے کہ کسی فعل کے ساتھ جب حرفِ جار Preposition آئے تو معنی میں بے انتہا تبدیلی آجاتی ہے۔ Get on,Get up, Take over,Take off وغیرہ کو دیکھتے جایئے اصل فعل کے معنی ہی ختم ہو جاتے ہیں ،یہی حال عربی زبان کا ہے، ''ضرب'' کے عام معنی مارنا ہیں لیکن اسکے معنی ڈھالنے کے بھی ہیں، ضرب کے ساتھ ''کی'' کا حرفِ جار آئے تو اسکے معنی بیان کرنا ہیں، ضرب کے بعد ''فی'' آئے تو سفر کرنا کے معنوں میں آتا ہے مگر ہمارے متبحرمین اکثر اس کا خیال نہیں رکھتے۔

ان باتوں کو بھی چھوڑ یئے یہ جو اتنے سارے فرقے پیدا ہو گئے یہ سب علماء ہی کے تو پیدا کردہ ہیں، یہ سب اپنی تائید میں قرآن کی آیات پیش کرتے رہتے ہیں، کیا اس کتاب میں یہ سارے اختلاف ہیں؟ نہیں کیونکہ قرآن اسی بات کو تو اپنے من جانب اللہ ہوئے کی دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ:

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا

اور اگر یہ قرآن غیر اللہ کی طرف سے (نازل شدہ) ہوتا تو وہ اس میں کثیر اختلاف پاتے۔

اصل میں یہ سارا جھگڑا اس لئے پیدا ہوا کہ قرآن کو قرآن سے سمجھنے کی بجائے بعض روایات ذہن میں جما کر قرآن کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی گئی، اس طرح قرآن

کوتاویل کے خراد پر چڑھایا گیا اور حسبِ منشاء معنی برآمد کر لیے گئے۔ یہاں میں ایک مثال بیان کرنے پر مجبور ہوں۔ مسلمان عورت کی دیت کا مسئلہ لیجئے قرآن حکیم میں دیت کے سلسلہ میں صرف ایک آیت آئی ہے، وہ یہ کہ:

اور جو مومن کو بھول چوک میں قتل کر بیٹھے تو چاہیے کہ ایک مسلمان غلام آزاد کرے اور مقتول کے ورثاء کو دیت یعنی خون بہا ادا کرے۔

ظاہر ہے کہ ''مومن کو قتل کرے'' میں مومن مرد اور مومن عورت دونوں شامل ہیں، علمائے کرام ان معنوں کو سمجھتے ہیں مگر یہ معنی مانتے نہیں کیونکہ ذہن ہیں وہ روایت بیٹھی ہوئی ہے جس میں کہا گیا کہ عورت کی دیت مرد سے آدھی ہے۔ یوں قرآن کے حکم کا کیا حشر ہوتا ہے؟ مولانا ظفر احمد عثمانی فرماتے ہیں کہ

''حاصل یہ ہے کہ آیت کے ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ عورت اور مرد کی دیت برابر ہونی چاہیے لیکن ہم نے آثار اور اجماع کی وجہ سے آیت کو اس کے ظاہر معنی سے موڑ لیا ہے'' (اعلاء السنن ج 18 ص 162)

دیکھا آپ نے کہ ہمارے علماء کرام روایات کو دیکھ کر آیاتِ خداوندی کو ظاہری معنوں سے موڑ لیا کرتے ہیں۔

قرآن کا دکھ ایک ایسی کتاب ہے جس میں دلائل و براہین کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ قرآنِ عظیم خدا کی وہ کتابِ ہدایت ہے جو ہر دور میں انسان کے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، قرآن کو قرآن سے سمجھا جائے تو ہر سوچنے والے کا ذہن ایک ہی نتیجہ تک پہنچتا ہے۔ اختلاف صرف اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے جب ہم خالی الذہن ہو کر قرآن کا مطالعہ نہیں کرتے اور اُسے روایات کے پیچھے ''موڑتے'' رہتے ہیں۔ مصنف کتاب اسرار ایوب روایات کے پرکھنے کا معیار قرآن کو بناتا ہے اور قرآن کی مطابقت میں آنے والی

روایات کو انتہائی احترام کے ساتھ نقل کرتا ہے۔

قرآن نے عربی زبان کے بعض الفاظ کو اپنی مخصوص (Term) بنا کر ایک خاص مفہوم دے دیا جب ایسا ہوتا ہے تو پڑھنے اور سمجھنے والے کا فرض ہے کہ وہ اسے اُسی مخصوص مفہوم کو ذہن میں رکھ کر پڑھے اور سمجھے۔ مثال کے طور پر یہ دیکھیئے کہ ''خودی'' فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہوتے ہیں غرور تکبر۔

یاس یگانہ چنگیزی کہتا ہے کہ:

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

لیکن اقبال نے خودی کو خودشعوری اور معرفتِ ذات کے معنوں میں استعمال کر کے اپنی مخصوص اصطلاح بنالیا، اب جو بھی اقبال کا مطالعہ کرے گا اُس کا فرض ہوگا کہ وہ اس لفظ کو انہی معنوں میں لے جن کیلئے اقبال نے مخصوص کرلیا ہے۔ اور اقبال کے قارئین ایسا ہی کرتے ہیں مگر افسوس ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے لوگ قرآن کی مخصوص اصطلاحات کا خیال نہیں کرتے بلکہ قرآن کے ساتھ یہ ظلم بھی ہوا ہے کہ اسکی مخصوص اصطلاحات کو دوسری زبان کے کسی محدود اور بسا اوقات بے معنی لفظ سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔

مثال کے طور پر قرآن کی ایک مخصوص اصطلاح ''صلوٰۃ'' ہے یہ ایک پورے نظام کو محیط ہے جس میں مخصوص اوقات میں ایک جگہ (مسجد) پر جمع ہو کر قیام و رکوع و سجود کے ساتھ اجتماعی مسائل پر سوچ بچار، امدادِ باہمی کی عملی شکل اور کاروبار میں دیانت وغیرہ سب کچھ آجاتا ہے مگر ہم نے اس وسیع المعانی اصطلاح کا ترجمہ ''نماز'' کر دیا، ''نماز'' کا لفظ مجوسیوں کی پوجا پاٹ کے لئے استعمال ہوتا تھا، لفظ صلوۃ اپنی وسیع جہات سے محروم ہوا تو اس کا مفہوم بھی وہی رہ گیا اور یہ نظامِ صلوٰۃ پوجا پات کے طریقہ تک محدود ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے کہا تھا جنابِ پیغمبرِ انسانیتؐ پر صلوٰۃ کرو یعنی انؐ کی مدد، تائید اور حمایت کرو لیکن ہم نے یہاں صلوٰۃ کو ایک ایسے لفظ ''درود'' سے بدل دیا جو تقریباً بے معنی ہے فارسی میں ''درودن'' ایک مصدر ہے جس کے معنی کاٹنا ہیں، معلوم نہیں کس نے کب اور کن مقاصد کے تحت یہ لفظ استعمال کیا تھا اور ہم اسی طرح استعمال کرتے چلے آرہے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی مخصوص اصطلاحات کو اپنی طرف سے استعمال کردہ الفاظ تک محدود کر دینا اور انہیں ان کے وسیع تناظر میں نہ لینا بھی قرآن فہمی میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

قرآن فہمی میں ایک اور بڑی رکاوٹ وہ عقائد ہیں جو مجوسی، یہودی اور عیسائی حضرات کی طرف سے مسلمانوں کے ذہنوں میں منتقل ہو گئے، انہیں بھی اسلامی عقائد سمجھ لیا گیا۔ عورت کا مرد سے کم تر ہونا اور اُسے گناہِ آدم کی اصل ذمہ دار قرار دینا، ایصال ثواب، دعا، تقدیر، وسیلہ، موت کا وقت مقرر ہونا یہ اور اسی جیسے بہت سے عقائد ہم نے یہودیوں اور عیسائیوں کے تحریف شدہ مذاہب سے لے کر اسلام کے کھاتے میں ڈال دیئے اور انہیں ذہن میں جما کر قرآن پڑھنے لگے تو قرآن کے اصل مفہوم سے بیگانہ ہو کر تاویل کے اندھیروں میں بھٹکنے لگے اور قرآن کو وہ مفہوم پہنا دیا جو صاحبِ قرآن نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اقبال اسی کا ماتم کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

زما بر صوفی و ملا سلامے
کہ پیغامِ خدا گفتند مارا
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت
خدا و جبرئیل و مصطفٰے را

(ہماری طرف سے صوفی و ملا کو سلام کہ وہ ہمیں خدا کا پیغام سنانے

بیٹھے ہیں لیکن ان کی تاویلات نے خدا، جبرئیل اور مصطفٰے کو حیرت
میں ڈال دیا ہے یعنی خدا حیران ہے کہ مولوی جو قرآن سنا رہا ہے یہ
میں نے تو نہیں بھیجا، جبرئیل حیران ہے کہ میں نے تو یہ قرآن محمد
رسول اللہؐ کو نہیں پہنچایا اور محمدؐ حیران ہیں کہ میں نے تو اس مفہوم کا
قرآن امت کے حوالے نہیں کیا)

''قرآن کا دکھ'' لکھنے والے اسرار ایوب نے ایسے بہت سے موضوعات کا استسقاء کیا ہے جن میں اصل قرآن کچھ اور کہتا ہے اور قرآن کے منہ میں اپنی زبان ڈال کر بات کرنے والے مروجہ عقائد کے وارث کچھ اور کہتے ہیں۔ اس کتاب میں چوبیس ایسے موضوعات آ گئے ہیں کہ گویا دریا کو کوزے میں بند کرنے والی بات ہے۔ چند موضوعات یہ ہیں ''سب سے بڑی سنت، استحصالی ٹولہ، کیا دنیا کافروں کے لئے ہے، قل العفو، دعا، ایصالِ ثواب، وسیلہ، کیا موت کا وقت مقرر ہے؟، تقدیر، مشیت ایزدی، خیر و شر، خدا کا تصور، طلاق و حلالہ''۔

''قرآن کا دکھ'' میں میرے لئے کوئی چیز نئی نہیں لیکن اس عمر میں (پچھتر سالہ) جب سب قوی مضمحل ہیں میں نے کتاب کا مطالعہ شروع کیا تو ہر لفظ اور ہر جملہ دلچسپ تھا سو پڑھتا چلا گیا، ایسا صرف اس لیے تھا کہ مجھے اندازِ بیان میں بڑی ندرت اور بڑی دلکشی نظر آئی، مصنف نے اس خوبصورت انداز سے ایسے بڑے اور حکیمانہ موضوعات پر بحث کی ہے کہ کتاب افسانے اور انشائیے سے زیادہ جاذبِ توجہ ہو گئی۔

خدا مصنف کو اور حسنِ بیاں عطا کرے کہ وہ اسی طرح قرآنِ عظیم کی خدمت کرتا رہے، اس کا یہ انداز روز افزوں ہوتا جائے۔ بات میں سادہ و آزاد اور معانی میں دقیق، ہم اگر قرآن کو اس طرح پڑھنے اور سمجھنے لگیں تو صرف امت مسلمہ میں انقلابِ حال نہیں بلکہ

پوری انسانیت کا آج روش اور کل درخشاں تر ہو جائے گا۔

یقین کیجیے آج کا انسان بہت دکھی ہے اُس نے بہت ٹھوکریں کھالی ہیں اندھیروں میں بھٹک بھٹک کر اُس کے قدم ہی تھکن سے چور نہیں ہوئے بلکہ اس کی روح بھی زخم زخم ہوگئی ہے اسے سکون مل سکتا ہے تو اسی نورانی کتاب سے۔

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنف کہیں بھی قاری پر اپنی بات ٹھونسنے کی کوشش نہیں کرتا وہ جگہ جگہ قرآنی آیات اور احادیثِ مقدسہ لکھتا چلا جاتا ہے اس طرح اس کا ہر دعویٰ مدلل اور ہر اعلان برہان الفرقان ہے۔

آخر میں میں ایک بات ضرور کہوں گا کہ کتاب پڑھ کر قدامت پرستوں کی طرف سے کہا جائے گا کہ ''یہ نئی بات کدھر سے آ گئی، یہ نیا دین ہے وغیرہ وغیرہ'' اس کا میں پیشگی جواب عرض کر دوں کہ دین تو صرف ایک ہی ہے۔ قرآن وضاحت کرتا ہے کہ یہی دین نوحؑ وابرہیمؑ کا تھا موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کا تھا اور تمام انبیاء کا تھا مگر جب بھی کوئی نبی آیا لوگوں نے کہا یہ نئی باتیں ہیں ہمارے آباؤ اجداد سے جو کچھ ہمیں ورثہ میں ملا ہے یہ وہ تو نہیں۔ انبیاء کرام تو خیر انبیاء کرام، جس انسان نے بھی عقل وفکر کا دامن تھاما تو اس کے خلاف ایسی ہی باتیں کی گئیں۔ حق کو ہمیشہ ہر دور میں اجنبی سمجھا گیا۔ اسلیے کہ روشنی آئی تو جہالت کے اندھیرے بھی گھٹا کر کے آ گئے اور کچھ عرصہ بعد اندھیرے ہی اندھیرے رہ گئے پھر جب روشنی آئی تو آنکھیں چندھیا گئیں کہ وہ اس کی عادی نہیں تھیں، روشنی اجنبی تھی۔ اس تمام بات کو جنابِ رحمت عالمؐ نے ایک حدیث میں بڑے اعجازِ بلاغت سے سمیٹ دیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ:

بـدء الاسـلام غـریباً و سیعود الی الغرباء فطوبی للغرباء

(اسلام کی ابتداء ہوئی تو اسے اجنبی سمجھا گیا۔ یہ عنقریب ان لوگوں میں لوٹ جائے گا جنہیں معاشرہ میں اجنبی سمجھا جائیگا پس مبارک ہو ان لوگوں کو جنہیں اجنبی سمجھا جائے گا)۔

سید **نصیر** شاہ (میانوالی)

سابق ممبر ایڈوائزری کمیٹی اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

قرآن کی فریاد

(علامہ ماہر القادری)

طاقوں میں سجایا جاتا ہوں آنکھوں سے لگایا جاتا ہوں
تعویز بنایا جاتا ہوں دھو دھو کے پلایا جاتا ہوں
جزدان حریر و ریشم کے اور پھول ستارے چاندی کے
پھر عطر کی بارش ہوتی ہے خوشبو میں بسایا جاتا ہوں
جس طرح سے طوطا مینا کو کچھ بول سکھائے جاتے ہیں
اس طرح پڑھایا جاتا ہوں اس طرح سکھایا ہوں
جب قول وقسم لینے کے لیے تکرار کی نوبت آتی ہے
پھر میری ضرورت پڑتی ہے ہاتھوں پہ اٹھایا جاتا ہوں
دل سوز سے خالی رہتے ہیں آنکھیں ہیں کہ نم ہوتی ہی نہیں
کہنے کو میں اک اک جلسے میں پڑھ پڑھ کے سنایا جاتا ہوں
نیکی پہ بدی کا غلبہ ہے سچائی سے بڑھ کر دھوکہ ہے
اک بار ہنسایا جاتا ہوں سو بار رُلایا جاتا ہوں
یہ مجھ سے عقیدت کے دعوے قانون پہ راضی غیروں کے
یوں بھی مجھے رسوا کرتے ہیں ایسے بھی ستایا جاتا ہوں
کس بزم میں مجھ کو بار نہیں کس عرس میری دھوم نہیں
پھر بھی میں اکیلا رہتا ہوں مجھ سا بھی کوئی مظلوم نہیں

مرحلہ ء اضطراب

آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے لیکن اکثر انسان پیدائشی طور پر ہی اس حق سے محروم ہوتے ہیں۔قرآن ہر انسان کو(انسان ہونے کی جہت سے) واجت التکریم قرار دیتا ہے(70/ نبی اسرائیل) اور کسی انسان کو بھی (چاہے وہ خدا کا نبی ہی کیوں نہ ہو) کسی دوسرے انسان پر حکومت کا حق نہیں دیتا(79/ال عمران)۔

قرآن تمام نوع انسانی کی آزادی کے لیے نازل کیا گیا اور نبی اکرمؐ کا مشن (قرآن ہی کے بقول) یہ تھا کہ آپؐ (نظام خداوندی کے قیام سے) ان بوجھوں کو اتار دیں جن کے نیچے انسانیت دبی ہوئی ہے اور ان زنجیروں کو توڑ دیں جن میں انسان جکڑا ہوا ہے ((157/الاعراف) اور یہی باقی انبیاء کرام کا مشن بھی تھا کہ قرآن کی رو سے ''قرآن خدا کی طرف سے نازل ہونے والی پچھلی تمام کتابوں کی تعلیم کو سچ کر دکھانے والی کتاب ہے'' (12/الاحقاف)۔

قرآن کہتا ہے کہ:

''اے پیغمبرؐ ہم نے تمہاری طرف اس طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوحؑ اور ان نبیوں پر جو نوحؑ کے بعد ہوئے بھیجی تھی اور جس طرح ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، اولادِ یعقوب، عیسٰیؑ، ایوبؑ، یونسؑ، ہارونؑ اور سلیمانؑ پر بھیجی اور داؤدؑ کو زبور عطا کی۔ نیز خدا کے وہ رسول جن کا حال ہم (قرآن میں) پہلے سنا چکے ہیں اور وہ جن کا

حال ہم نے تمہیں نہیں سنایا (165-163/النساء) خدا نے تمہارے لئے وہ نظام زندگی (دین) تجویز کیا ہے (جو کوئی نیا نظام نہیں بلکہ اب سے بہت پہلے) جس کی ہدایت نوحؑ کو بھی کی جا چکی ہے اور (اے محمدؐ) جس کی ہم تمہاری طرف وحی کر رہے ہیں (تم سے پہلے اسی نظام کو قائم کرنے کی) ہم نے ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ کو بھی ہدایت فرمائی تھی'' (13/الشوریٰ)

یعنی تمام انبیاء کرام ایک ہی مقصد کے تحت مبعوث کیے گئے اور وہ مقصد یہ تھا کہ ''نظامِ خداوندی کے قیام سے ان زنجیروں کو توڑ دیا جائے جن میں انسان جکڑا ہوا ہے''۔ وہ زنجیریں تین طرح کی ہیں:

.....پہلی زنجیر ملوکیت کی ہے جو انسان کی طبیعی آزادی پر قابض ہو جاتی ہے۔

.....دوسری زنجیر سرمایہ پرستی کی ہے جو انسان کو اس کی اخلاقی آزادی سے محروم کر دیتی ہے۔

.....اور تیسری زنجیر مذہبی پیشوائیت کی ہے جو انسان سے اس کی فکری آزادی چھین لیتی ہے۔

قرآن کی رو سے فرعون، ہامان اور قارون بالترتیب ملوکیت مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ پرستی کے نمائندے اور انسانیت کے بدترین دشمن ہیں۔ قرآن فرعونیت، ہامانیت اور قارونیت کے گٹھ جوڑ کو ''مترفین'' کا نام دیتا ہے۔ (''مترفین'' یعنی دوسروں کی محنت پر عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے والے تن آسان لوگ / تفصیل 'استحصالی ٹولہ' کے عنوان کے تحت لکھ دی گئی ہے)۔ نظامِ خداوندی کے قیام سے مراد ایک ایسے معاشرے کا قیام ہے .....جو خدا کے لئے خالص ہو یعنی جس میں حکومت کا حق صرف اور

صرف خدا کیلئے مخصوص ہو (11,12/الزمر) یعنی جس کا آئین قرآن ہو (105/النساء، 50-48/المائدۃ وغیرہ)

.....جس میں (قرآنی تفاصیل) حکومتی امور (وقت وحالات کے مطابق) باہمی مشاورت سے طے کیے جائیں (38/الشوریٰ)

.....جس میں کسی انسان کو بھی (خواہ وہ خدا کا نبی ہی کیوں نہ ہو) کسی دوسرے انسان پر حکومت کا حق حاصل نہ ہو (79/ال عمران)

.....جس میں انسان کی عزت (نسب و امارت وغیرہ کے طفیل نہیں بلکہ) انسان ہونے کی وجہ سے ہو (70/بنی اسرائیل)

.....جو عدل پر مبنی ہو (152/الانعام، 29/الاعراف، 90/النحل وغیرہ) اور عدل بھی ایسا کہ ایک طرف تو دشمن کے ساتھ بھی ناانصافی نہ ہو (8/المائدہ) اور دوسری طرف رشتہ دار کے ساتھ بھی انصاف ہو (152/الانعام)

.....جس میں فضیلت کا معیار رنگ و نسل و دولت نہیں ہو بلکہ اچھائی و اہلیت یعنی تقویٰ ہو (13/الحجرات)

.....جس میں عزت کے مدارج ذاتی جوہر کی بنیاد پر ہوں (19/الاحقاف)

.....جس میں حکومتی امور (نااہل لوگوں کے سپرد نہیں ہوں بلکہ) ان لوگوں کے سپرد ہوں جو انہیں سنبھالنے کے اہل ہوں (58/النساء)

.....جس میں رب کی بخشش کے گرد حصار نہ کھینچا گیا ہو (20/بنی اسرائیل) یعنی پیداوار کے ذرائع (زمین، پانی وغیرہ) کسی کی ذاتی ملکیت نہ ہوں بلکہ تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلے

رہیں (10/حم السجدہ نیز دیکھیے 10/الرحمٰن)

.....اور جس کے معاشی نظام کی عمارت ''قل العفو'' کی بنیاد پر اٹھے (219/البقرۃ) یعنی معاشرے کا ہر فرد اپنی کمائی کا اتنا حصہ خود ''لے'' لے جتنا اسے جائز طور پر ضرورت ہو (تا کہ اس کے جسم کی پرورش ہو اور اس کی دنیا اچھی ہو جائے) اور باقی کا حصہ فلاحِ عامہ میں ''دے'' دے (تا کہ اس کی ذات/روح کی پرورش ہو اور اس کی آخرت بھی اچھی ہو جائے) (تفصیل کے لئے ''قل العفو'' اور ''کیا دنیا کافروں کے لئے ہے'' کے عنوانات دیکھ لیجئے)

یہی وہ معاشرہ ہے جسے قائم کر کے انسان اپنا کھویا ہوا مقام واپس حاصل کر سکتا ہے یعنی وہ ایک بار پھر اس جنتی کیفیت میں داخل ہو سکتا ہے جس سے اسے اپنی خود غرضی کے باعث بے دخل کر دیا گیا تھا (36,38/البقرۃ)۔ اور وہ جنتی کیفیت یہ ہو گی کہ:

.....ہر طرف رزق کی فراوانی ہو گی (62/مریم)

.....جس کا جہاں سے جی چاہے گا کسی روک ٹوک کے بغیر (پیٹ بھر کر) کھالے گا (35/البقرۃ)

.....ہر انسان روٹی، کپڑا اور مکان کی فکر سے مکمل طور پر آزاد ہو گا (118,119/طٰہٰ)

.....کسی انسان کے دل میں عداوت و حسد کے جذبات نہیں ہوں گے (43/الاعراف، 47/الحجر)

.....تمام انسان ایک برادری کی حیثیت سے رہیں گے (19/یونس)

.....ہر طرف امن ہی امن ہو گا، سلامتی ہی سلامتی ہو گی (46/الحجر)

.....نہ کوئی رنج ہوگا نہ کوئی تکان (35/فاطر)

.....اور یہ کیفیت عارضی نہیں بلکہ دائمی ہوگی (48/الحجر)

ہر نبی کی تحریک کا مقصد کیونکہ نظامِ خداوندی کا قیام تھا اور نظامِ خداوندی میں ''مترفین'' کے لیے کسی قسم کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی لہذا ہر نبی کی مخالفت ''مترفین'' ہی کی طرف سے ہوئی (23,24/الزخرف)۔

قرآن کے بقول:

''اے محمدؐ اگر یہ لوگ تجھے جھٹلاتے ہیں تو (یہ کوئی نئی بات نہیں کہ) تم سے پہلے پیغمبر بھی جھٹلائے گئے ہیں (4/فاطر، 184/ال عمران، 12-14/ق، 44-42/الجنیز وغیرہ) (تفصیل کے لیے ''دل کے اندھے'' دیکھ لیجئے)

ہر نبی نے خدا کی طرف سے نازل ہونے والی وحی کے ذریعے لوگوں کی رہنمائی نظامِ خداوندی کے قیام کی طرف کی۔ لیکن ہر نبی کے بعد مترفین نے ہر نبی کی تعلیمات میں اپنے مفادات کی آمیزش کردی (52/الحج)۔ قرآن کا مقصد اس آمیزش کو مٹانا اور اختلافات کو دور کرنا ہے (64,63/النحل) (تفصیل ''خدا کا تصوّر'' میں مل جائے گی)۔

دیگر آسمانی کتابوں کے تو الفاظ تک تبدیل کردیے گئے۔ لیکن قرآن کی حفاظت کا ذمہ کیونکہ خدا نے خود اٹھا رکھا ہے (9/الحجر) اور اس کے الفاظ میں تبدیلی ممکن نہیں۔ لہذا فرعونیت، ہامانیت اور قارونیت (ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ پرستی) کے گٹھ جوڑ نے یہ کیا کہ پہلے اپنی خواہشات کے مطابق روایات مرتب کیں پھر ان وضعی روایات کی روشنی میں قرآن کریم کو سمجھنے اور سمجھانے کا رواج ڈال کر قرآن کا مفہوم ہر ممکنہ حد تک اپنی ضروریات کے مطابق بنالیا (تفصیل ''قرآن کا دکھ'' کے عنوان میں دیکھیے)۔

حضور اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ:

''اللہ کا ارشاد ہے کہ (نظامِ خداوندی کے دشمن) لوگ اللہ کے کلام کو بدلنا چاہتے ہیں'' (بخاری)

اور قرآن میں لکھا ہے کہ

''ان لوگوں کے لئے ہلاکت اور تباہی ہے جو اپنی طرف سے شریعت کے احکام لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ (احکام) خدا کی طرف سے ہیں تا کہ ان کے عوض تھوڑا سا فائدہ حاصل کرلیں۔ ان لوگوں نے اپنی طرف سے جو کچھ لکھا وہ بھی ان کیلئے تباہی کا سامان ہے اور اس کے عوض جو فائدہ حاصل کیا وہ بھی موجب ہلاکت ہے'' (79/البقرۃ)

علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے کہ:

قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر
چاہیں تو خود اک تازہ شریعت کریں ایجاد

احکام ترے حق ہیں مگر تیرے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پازند

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

''مترفین'' نے وضعی روایات کے ذریعے اپنی بقا کے لیے ایسے ایسے غیر اسلامی/غیر انسانی عقائد اسلام سے منسوب کیے کہ جن کے بارے میں سوچ کر بھی دل دہل اٹھتا ہے

مثال کے طور پر حذیفہؓ بن یمان سے روایت ہے کہ ''حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ:

''میرے بعد (کچھ اس طرح کے) امام ہوں گے جو میرے طریقہ پر نہیں چلیں گے اور میری روش اختیار نہیں کریں گے اور ان میں سے بعض لوگ ایسے ہوں گے جن کے جسم انسانوں جیسے ہوں گے اور دل شیطانوں جیسے ہوں گے۔ میں نے پوچھا اس وقت میں کیا کروں؟ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ حکام کے احکام کو سننا اور ان کی اطاعت کرنا اگرچہ تمہاری پُشت پر ضربیں لگائیں جائیں اور تمہارا مال چھین لیا جائے'' (مسلم)

ایک اور روایت کے مطابق

ایک شخص نے حضور اکرمؐ سے پوچھا کہ بتایئے اگر ہم پر ایسے حاکم مقرر ہوں جو ہم سے ہمارے حقوق روک کر رکھیں اور اپنے حقوق کا مطالبہ کریں (تو ہم کیا کریں)؟ آپؐ نے جواباً فرمایا تم ان کی بات سنو اور ان کا حکم مانو۔ ان کی ذمہ داری ان پر ہے اور تمہارے فرائض تم پر ہیں (ترمذی)

ان روایات کے مضامین (بذات خود) پکار پکار کر اس حقیقت کا اعلان کر رہے ہیں کہ انہیں نظامِ خداوندی کے دشمنوں نے اپنے مفادات کے تحت گھڑ کر حضور اکرمؐ سے منسوب کیا ہے کیونکہ یہ روایات قرآنی تعلیمات کے یکسر خلاف ہیں۔ آپ خود ہی سوچیے کہ کیا حضور اکرمؐ قرآن کے خلاف کوئی بات کہہ سکتے تھے جبکہ آپؐ چلتا پھرتا قرآن تھے؟ حضرت عائشہؓ کے بقول ''اللہ کے نبیؐ کا اخلاق قرآن تھا'' (مسلم)۔ حضور اکرمؐ نے تو یہ فرمایا کہ ''سب سے بڑا جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق بلند کرنا ہے'' (ترمذی) اور یہ

روایت بذات خود اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ یہ بجا طور پر نبی اکرمؐ کا فرمان مبارک ہے کیونکہ یہ قرآنی تعلیم کے عین مطابق ہے۔ (کسی روایت کے ضعیف ہونے یا نہ ہونے کا معیار اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ قرآن کی مخالفت یا تائید میں ہو؟)

روایات کی مستند ترین کتب بھی تضادات سے بھری پڑی ہیں۔ ایک مثال تو آپ ملاحظہ کر ہی چکے ہیں (کہ جامع ترمذی کے ایک صفحے پر وہ روایت درج ہے جس کی رو سے نبی اکرمؐ نے ظالم حکمران کی اطاعت بھی لازمی قرار دی ہے اور جامع ترمذی ہی کے دوسرے صفحے پر وہ روایت لکھی ہے جس کی رو سے حضور اکرمؐ نے ظالم حکمران کی حکم عدولی کو سب سے بڑا جہاد قرار دیا ہے)۔ ایک مثال اور بھی ملاحظہ کر لیجئے کہ ''مترفین'' نے مسلمانوں کو بے عمل بنانے کے لئے ان میں (وضعی روایات کے ذریعے) یہ عقیدہ بھی مقبول کر دیا کہ ''جس شخص نے بھی کلمہ شہادت پڑھ بھی لیا وہ جنت میں چلا جائے گا''۔ چنانچہ مسلمان عام طور پر اس دلیل کے ساتھ غلط روش پر چلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ ''ایک نہ ایک دن تو ہم جنت میں چلے ہی جائیں گے''۔ یہ عقیدہ بھی اسلامی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے کہ قرآن کے بقول

> .....''کیا لوگ یہ خیال کیے بیٹھے ہیں کہ (صرف) یہ کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے آئے انہیں چھوڑ دیا جائے گا اور انہیں آزمائشوں (یعنی حق و باطل کے تصادمات کی بھٹی) میں سے نہیں گزرنا پڑے گا''
>
> (العنکبوت/2)

> .....''کیا تم یہ خیال کیے ہوئے ہو کہ (یونہی) جنت میں داخل ہو جاؤ گے (اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو بالکل غلط سمجھتے ہو کہ جنت میں داخل ہونے کے لئے) تمہیں بھی ان صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑے گا جن سے وہ لوگ گزرے جنہوں نے اس سے پہلے نظام خداوندی کو قائم کرنے

کی کوشش کی۔ سختیاں اور مصیبتیں انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتیں جن کی شدت سے ان کے دل ہل جاتے۔ یہاں تک کہ وہ اور ان کا رسول پکار اٹھتے کہ اے خدا ہماری کوششوں کی بار آوری کا وقت کب آئے گا'' (214/البقرۃ دیکھیے 142/ال عمران، 16/التوبۃ)

آپ نے دیکھا کہ قرآن کے بقول جنت صرف کلمۂ شہادت پڑھ لینے سے نہیں مل جاتی کہ اسے حاصل کرنے کیلئے نظامِ خداوندی کو قائم کرنے کی عملی کوشش سے گزرنا پڑتا ہے جو بڑی کھٹن ہوتی ہے۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ اس کوشش میں (اور تو اور) حضور اکرمؐ جیسی بلند و بالا ہستی کو بھی کیسے کیسے جانکاہ مراحل سے گزرنا پڑا؟

مسلمان جس فکری اور عملی بدحالی کا شکار ہیں وہ تاریخ کی نگاہ میں کوئی نئی بات نہیں کہ ہر عروج یافتہ قوم اپنے مترفین کے ہاتھوں اسی بے راہ روی سے گزر کر اپنے عبرت ناک زوال تک پہنچی۔ قرآن کہتا ہے کہ:

''کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں (یعنی کیا انہوں نے تاریخی شواہد کا مطالعہ نہیں کیا؟ کیا انہوں نے اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات پر توجہ نہیں دی) تا کہ یہ لوگ دیکھ سکتے کہ جو لوگ ان سے پہلے گزرے ان کا انجام کیا ہوا'' (109/یوسف، 42/الروم)

کیا انہیں اس (امر) سے ہدایت نہیں ہوئی کہ ان سے پہلے کتنی ہی قومیں انہی مقامات پر قانون خداوندی کے تحت ہلاک ہوئیں جن (مقامات) پر چلتے پھرتے ہیں (26/السجدۃ)

(اے محمدؐ) ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ مکذبین (یعنی احکامِ الٰہی کی نافرمانی کرنے والوں) کا کیا انجام ہوا (11/الانعام،

137/ آل عمران، 36/النحل)

ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ مجرمین کا کیا انجام ہوا (69/النمل) (وہ لوگ تباہ و برباد ہو گئے حالانکہ) وہ ان سے کہیں زیادہ طاقتور تھے (9/الروم، 44/فاطر، 82، 21/المومن) (لیکن وہ ناحق تباہ برباد نہیں ہوئے کہ) خدا ایسا نہیں کہ وہ کسی پر ظلم کرے بلکہ (وہ لوگ اپنے ہی برے اعمال کی وجہ سے تباہ و برباد ہوئے) انہوں نے اپنے آپ پر خود ظلم کیا (9/الروم)

(ان لوگوں نے سچائی سے آنکھیں پھیر رکھی ہیں) کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں تا کہ (سابقہ اقوام کا عبرت ناک انجام دیکھ کر) ان کے دلوں میں غور وفکر کرنے اور ان کے کانوں میں سننے کی استطاعت پیدا ہوتی؟ (جب لوگ حقائق سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں تو) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں (46/الحج)

(انہیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ) جو قوم بھی (ان اقوام کی روش پر چلے گی جو تباہ و برباد ہوئیں اور) نظامِ خداوندی سے انکار کر دے گی وہ بھی (انہی اقوام کی طرح) تباہ برباد ہو جائے۔

(10/محمدؐ)

(کیونکہ یہ تباہی اور بربادی خدا کے قانون کے تحت آتی ہے اور) خدا کا قانون (کلمۃ اللہ اور سنت اللہ) ان لوگون کیلئے بھی یہی تھا جو گزر چکے ہیں اور تمہارے لئے بھی یہی ہے۔ تم خدا کے قانون میں کسی قسم

کی تبدیلی نہیں پاؤ گے‘‘(62/الاحزاب)

آیئے اب خدا کی ہدایت کے مطابق زمین میں چلتے پھرتے ہیں اور ان لوگوں کا انجام دیکھتے ہیں جو ہم سے پہلے گزرے۔ ساتویں صدی کے عیسائیوں کی تاریخ پر ہی نگاہ دوڑایئے کہ جنہوں نے بہت عروج بھی دیکھا اور بہت زوال بھی۔ ان کے عبرت ناک انجام کے اسباب سنیے اور بہت غور سے سنیے۔

ڈریپر لکھتا ہے کہ:

’’اگرچہ عیسائی جماعت اس قدر طاقتور ہو چکی تھی کہ اس نے جسے بھی اپنا مفید مطلب سمجھا، تخت پر بٹھا دیا۔ لیکن یہ قدرت اسے پھر بھی حاصل نہیں ہوئی تھی کہ اپنے حریف یعنی بت پرستی کو مکمل طور پر مفلوج کر سکے۔ دونوں کی باہمی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر و شکر ہو گئے اور ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا جس میں بت پرستی اور عیسائیت کی شاخیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھیں... بت پرستی کی رسمیں اختیار کر لی گئیں۔ پرستش کے نمائشی اور بھڑکیلے طریقے جاری ہو گئے عبادت میں باراتوں کے جلوس کی سی دھوم دھام نظر آنے لگی..... شہداء کے مزاروں پر گرجے بنائے جائے لگے اور ان کی تطہیر اور تقدیس ان رسموں کے ذریعے ہونے لگی جو سلف میں بت پرست پجاریوں کے ہاں رائج تھیں۔ جھوٹ سچ جہاں کہیں بھی کسی شہید کے کچھ آثار بہم پہنچ گئے تو فوراً ان کی یادگار میں میلے اور عرس قائم کر دیے گئے۔ خدا کے غضب کو ٹالنے اور آسیب اتارنے کا سب سے بڑا ذریعہ فاقہ کشی قرار دیا گیا۔ شہداء کے مزاروں کی زیارت وطواف کے

لیے لوگ ہزار ہا کوس چل کر جاتے تھے..... بت پرستی کے زمانے میں انسان کو دیوتا بنا دیا جاتا تھا، عیسائیوں نے اسے ولی کر دکھایا کہ اس کا تصرف بھی انسانی معاملات میں خدا کی مداخلت سے کسی طرح بھی کم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مقامی دیوتاؤں کی جگہ مقامی پیر اور اولیاء قائم ہو گئے''۔

(Conflict Between Religion And Science)

اور سیل اپنے ترجمہ قرآن کے مقدمہ میں کہتا ہے کہ :

''گرجا کے پادریوں نے (عیسائی) مذہب کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے اور امن، محبت اور نیکی کو مفقود کر دیا تھا۔ اصل مذہب کو بھول کر اپنی قیاس آرائیوں پر جھگڑتے تھے''

اور بری فالٹ کے بقول:

''اگر ہم بازنطینی حکومت کے جمود و تعطل کے اسباب و علل دریافت کرنا چاہیں تو سب سے پہلے جاہل و متعصب راہبوں کا وہ ہجوم ہے جو اس سلطنت کی قوت کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ وہ ہر صوبہ اور قریہ میں ٹڈی دل کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ صرف ایک قسطنطنیہ میں کوئی ایک سو سے زیادہ خانقاہیں تھیں ... ہر دس قدم پر آپ کو گیسو دراز، کوتاہ آستین ''راس پوٹن نما'' مشائخ دکھائی دیتے تھے جن کے گرد عقیدت مندوں کا ہجوم ان کی دست بوسی کے لئے حلقہ بنائے رہتا۔ ہر شریف آدمی، ہر سوداگر، ہر دولت مند، ہر نیک خاتوں کوئی نہ کوئی خانقاہ بنواتی۔ ان فقیروں کا تسلط عوام کے دلوں میں بہت

گہرا تھا۔ وہ اپنی کرامات، معجزات اور تذکار والیاء سے لوگوں کو مرعوب کرتے..... ان کے خوارق و کرامات اور اولیاء کی تماثیل کی پرستش ہوتی، ہر مشکل میں ان سے مدد مانگی جاتی، تجارت میں کامیابی، متاع گم گشتہ کی بازیافت اور بیماری میں شفا کے لئے ان کی طرف رجوع کیا جاتا۔ چونکہ ان لوگوں کو عوام کی اندھی عقیدت حاصل تھی لہذا وہ حکام وقت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے تھے''۔

(The Making of Humanity)

چنانچہ ڈریپر کے بقول:

''فاسٹس نے قیصر آگسٹائن سے برملا ان ملامت آمیز الفاظ میں خطاب کیا کہ تم بت پرستوں میں کیا فرق باقی رہا؟ اگر فرق ہے تو بس اتنا ہے کہ تمھاری جماعت علیحدہ ہے اور ان کی جماعت علیحدہ، ورنہ افعال دونوں کے ایک ہی ہیں''۔

(Conflict Between Religion And Science)

ساتویں صدی کے عیسائیوں کی فکری و عملی بدحالی کی داستان آپ نے مختصر طور پر پڑھ لی ہے۔ اس داستان کو ایک بار پھر پڑھیے لیکن اس بار اس میں بت پرستی کی جگہ عیسائیت، عیسائیوں کی جگہ مسلمان، پادریوں کی جگہ مولوی، راہبوں کی جگہ پیر، خانقاہوں کی جگہ درگاہیں، کوتاہ آستین کی جگہ کوتاہ شلوار وغیرہ وغیرہ لکھ دیجیے۔ اور پھر فاسٹس والا سوال اپنے آپ سے پوچھیے کہ'' آج کے مسلمانوں اور ساتویں صدی کے عیسائیوں میں کیا فرق باقی رہا اگر فرق ہے تو بس اتنا ہے کہ دونوں کی جماعتیں علیحدہ علیحدہ ہیں ورنہ افعال دونوں کے ایک ہی ہیں''؟

ایک حدیثِ مبارک پر توجہ دیجئے کہ

حضر ابو واقدؓ سے روایت ہے کہ ''حضورؐ نے فرمایا کہ قسم ہے مجھے اس ذات کی جس کے ہاتھوں میں میری جان ہے کہ تم سب بھی اُنہی (عیسائیوں اور یہودیوں) کے راستے پر چلو گے جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں'' (ترمذی، نسائی)

حضرت اقبالؒ نے (جواب شکوہ) یونہی تو نہیں کہا کہ:

شور ہے ہوگئے دنیا سے مسلماں نابود
ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود
وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کہ شرمائیں یہود

اس حقیقت میں شک وشبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ آج کے مسلمان جس روش پر چل رہے ہیں اس پر چلنے والی ہر قوم تباہ و برباد ہوگئی کہ یہ روش سیدھی جہنم میں جاتی ہے۔

کاش گذشتہ اقوام کا عبرت ناک انجام دیکھ کر (جیسا کہ قرآن نے کہا) مسلمانوں کے دلوں میں غور وفکر کرنے اور کانوں میں سننے کی استطاعت پیدا ہو۔ اور وہ قرآن کو روایات کی روشنی میں سمجھنے کی بجائے قرآن ہی کی روشنی میں سمجھنا شروع کر دیں تا کہ ان کی نگاہ ایک بار پھر بلند، فکر ایک بار پھر کشادہ، بصیرت ایک بار پھر گہری ہو جائے اور وہ تخریب وتنزلی کے دلدل سے نکل کر تعمیر وترقی کی وادیوں میں امن ومحبت کے ایسے چراغ روشن کر دیں کہ جن سے ساری دنیا کی تاریکی دور ہو جائے۔

یہی وہ جستجو ہے جس نے مجھے ''قرآن کا دکھ'' سمجھنے اور لکھنے پر آمادہ کیا۔ اس کام میں کئی برس بیت گئے۔ موضوع کی مناسبت سے جو کتاب بھی جہاں کہیں سے بھی ملی،

پورے خلوص کے ساتھ (یعنی خالی الذہن ہوکر) اس کا مطالعہ کیا۔ اسی مطالعے کے نچوڑ کو اپنے الفاظ میں صرف اور صرف سوچنے سمجھنے والے لوگوں یعنی اربابِ عقل وبصیرت (اولی الالباب و اولی الا بصار) کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ صرف اور صرف سوچنے سمجھنے والے لوگوں کے لئے اس لئے کہ قرآن کی رو سے

قرآن نازل ہی ارباب عقل وبصیرت کے لیے کیا گیا (3/حم السجدۃ 52/ابراہیم) قرآن نازل ہی اس لیے کیا گیا کہ لوگ عقل وبصیرت سے کام لے سکیں (29/ص، 3/الزحزف وغیرہ) قرآن کو اہل عقل وبصیرت ہی سمجھ سکتے ہیں (43/العنکوب، 58,59/الروم)

رہا سوال اندھی تقلید کے پجاریوں کا تو وہ قرآن کے بقول دل کے اندھے ہیں (46/الحج) کہ ان کے اپنے ہی بُرے اعمال کی وجہ سے (14/المطففین) ان کے دلوں پر مہریں لگی ہوئیں ہیں (24/محمدؐ) (یعنی ان کی عقلیں بے کار رہ رہ کر استعمال کے قابل ہی نہیں رہیں) انہیں سمجھانا نہ سمجھانا برابر ہے (10/یٰسین) کہ نصیحت تو انہی لوگوں پر اثر کرتی ہے جو عقل وفکر سے کام لیتے ہیں (9/الزمر) لیکن یہ (دل کے اندھے) لوگ تو عقل وفکر سے کام لینے والے نہیں (42/یونس)۔

اسی لیے تو حضورِ اکرمؐ نے بھی یہی فرما رکھا ہے کہ:

''سمجھانے سے وہی سمجھتے ہیں جو عقل ودانش رکھتے ہیں'' (مسلم)

کیا دنیا کافروں کے لیے ہے؟

ایک زمانہ وہ تھا کہ اختر علی دوسروں کی ضرورتیں پوری کیا کرتا تھا اور ایک زمانہ یہ ہے کہ وہ خود ضرورت مند ہے۔ کچھ ہی برس پہلے کی بات ہے کہ وہ کپڑے کا ایک نہایت ہی دیانت دار اور کامیاب بیوپاری ہوا کرتا تھا، اس کی دکان شہر کی چند بڑی دکانوں میں سے ایک تھی، ہزاروں روپئے کی بچت روزانہ کا معمول تھا۔ اسی بچت سے اس کی بیوی نے ایک فلاحی ادارہ قائم کر رکھا تھا جس میں غریب اور بے سہارا عورتوں اور بچیوں کو سلائی کڑھائی کی تعلیم کے علاوہ رہائش اور روٹی بھی مفت فراہم کی جاتی تھی۔

اختر علی خود کی خوشگوار زندگی سے کئی سوگوار زندگیوں کو بھی خوشیاں مل رہی تھیں لیکن پھر ایک روز اس کی دکان پر ایک مذہبی جماعت آئی جس سے اُسے یہ معلوم ہوا کہ اس کا کامیاب کاروبار تو دراصل اس کے اور خدا کے درمیان ایک رکاوٹ ہے کیونکہ معاشی خوشحالی انسان کو خدا کی یاد سے غافل کر دیتی ہے۔ اسے یہ بتایا گیا کہ جن لوگوں کی دنیا اچھی ہوتی ہے ان کی آخرت اچھی نہیں ہوتی، اور یہ بھی سمجھایا گیا کہ کافر اور مومن میں فرق ہی یہی ہے کہ کافر آخرت کے بدلے دنیا خرید لیتا ہے جبکہ مومن دنیا کے بدلے آخرت کا سودا کرتا ہے اس کی توجہ اس آیت کی جانب بھی مبذول کرائی گئی کہ ''قیامت میں خدا ان سے کہے گا کہ تم اپنا حصہ دنیا میں لے چکے ہو۔ اب جہنم میں جاؤ'' (20/الاحقاف) اور اسے یہ روایت بھی سنائی گئی کہ صحابہ کرامؓ پر اگر زیادہ عرصے تک کوئی مصیبت نہیں آتی تھی تو وہ یہ سوچ کر پریشان ہو جاتے تھے کہ کہیں خدا ان سے ناراض تو نہیں ہو گیا۔

مذہبی جماعت تو چلی گئی لیکن اپنے ساتھ اختر علی کی نیند بھی لے گئی اور وہ تمام رات کروٹیں بدلتے ہوئے اپنی دنیاوی آسودگی کے بارے میں سوچ سوچ کر جہنم کی آگ میں جلتا رہا۔ آخر کار اس نے اپنی باقی کی زندگی خدا کی یاد میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا اور اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ غفلت کی بڑی گہری نیند سے ایک دم بیدار ہو گیا ہے۔ اس کے بعد اسکی توجہ کاروبار کے بجائے مذہب پر مذکور رہنے لگی جس کا نتیجہ کچھ ہی عرصے میں یہ نکلا کہ کاروبار نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔

بیوی نے بڑا سمجھایا کہ اپنا نہیں تو ان غریب اور بے سہارا عورتوں اور بچیوں کا ہی کچھ خیال کرو جنہیں تمھارے کاروبار نے سہارا دیا ہوا ہے؟ لیکن اختر علی وظیفوں، چلوں، تسبیح اور سہہ روزوں سے اپنی عاقبت سنوارنے میں اتنا مصروف ہو چکا تھا کہ اس کے پاس کسی کی آہ وزاریاں سننے کا وقت ہی نہ تھا۔ کاروبار بھی ٹھپ ہو گیا اور فلاحی ادارہ بھی، جس کے ساتھ ہی درجنوں مفلس و نادار عورتیں ایک بار پھر بے رحم سماج کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو گئیں۔

اختر علی کے مالی حالات بگڑتے بگڑتے اتنے بگڑ گئے کہ چند ہی برس میں وہ قرض کے بوجھ تلے دب گیا۔ اور پھر اس قرض کو چکانے کیلئے ایک روز اس نے بیوی کو بتائے بغیر ہی اپنا مکان بھی بیچ دیا لیکن وہ خوش تھا کہ آخر کار اس نے اپنے اور خدا کے درمیان حائل یہ آخری رکاوٹ بھی عبور کر لی۔

اب حال یہ ہے کہ اختر علی کی بیوی اپنے ماں باپ کے گھر رہتی ہے اور سلائی کڑھائی کے ایک سکول میں ملازمت کرتی ہے۔ اختر علی مسجدوں میں رہتا ہے اور آخرت کمانے میں اتنا مگن ہے کہ بے چاری بیوی کا خیال بھی کبھی کبھار ہی آتا ہے۔ بہر طور وہ مطمئن ہے کہ اب خدا قیامت میں اسے یہ نہیں کہہ سکے گا کہ تم نے اپنا حصہ دنیا میں لے لیا

ہے۔

کاش کوئی مذہبی جماعت اختر علی تک نبی ءکریمؐ کے یہ ارشادات بھی پہنچا دیتی کہ:

.... دنیا سے بے رغبتی اور زہد یہ نہیں کہ انسان اپنے اوپر کسی حلال کو حرام کر دے اور اپنے مال کو برباد کر دے (ترمذی)

.... اجر وثواب کے لحاظ سے بڑھا ہوا وہ دینار ہے جو آدمی اپنے بال بچوں اور زیرِ کفالت لوگوں پر خرچ کرتا ہے (مسلم، ترمذی)

.... جو شخص یتیم بچے کو کھلائے پلائے، یہاں تک کہ وہ (بچہ) اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے تو ایسے شخص کو جنت ملے گی۔

(ترغیب بحوالہ احمد)

.... صحابہؓ نے دیکھا کہ ایک شخص رزق کے حصول میں بہت متحرک ہے اور پوری دلچسپی لے رہا ہے تو حضورؐ سے عرض کیا کہ 'اے رسول اللہ اس کی یہ دوڑ دھوپ اور دلچسپی اللہ کی راہ میں ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا'؟ اس پر حضورؐ نے فرمایا 'اگر وہ چھوٹے بچوں کی پرورش کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں شمار ہوگی۔ اگر بوڑھے والدین کی پرورش کے لیے کوشش کر رہا ہے تو بھی فی سبیل اللہ ہوگی۔ اور اگر اپنی ذات کے لیے کوشش کر رہا ہے اور مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بچا رہے تو یہ کوشش بھی فی سبیل اللہ شمار ہوگی۔ البتہ اگر زیادہ مال حاصل کر کے لوگوں پر برتری جتائے اور لوگوں کو دکھائے تو یہ ساری محنت شیطان کی راہ میں ہوگی'

(ترغیب بحوالہ طبرانی)

یا کوئی اختر علی کو حضرت علامہ اقبال کے یہ اشعار ہی سنا دیتا جن میں شیطان اپنے مشیروں سے کچھ ان الفاظ میں مخاطب ہے کہ:

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مذاجِ خانقاہی میں اسے

کتنے تاسف کی بات ہے کہ دن رات خدا کے نام کا ورد کرنے والوں کو یہ بھی معلوم نہیں جس دنیاوی خوشحالی کو وہ خدا کی ناراضگی سے تعبیر کرتے ہیں وہی دنیاوی خوشحالی خود خدا کے بقول خدا کی نعمت ہے (129,137/الاعراف، 26/الانفال) جو لازمی طور پر مومنین کے حصے میں آتی ہے (26/الانفال، 41/الحج، 27/الاحزاب وغیرہ) کیونکہ خدا کے درست تصور پر ایمان لانے والوں اور قرآن کی اطاعت کرنے والوں سے خدا نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ انہیں دنیا کی حکومت دی جائے گی جس طرح ان جیسے پہلے لوگوں کو دی گئی تھی (55/النور) اور قرآن گواہ ہے کہ تمام انبیاء کرام اور انکے رفقائے کار کو دنیا میں غلبہ و اقتدار ملا (15/ابراہیم)۔ اور دوسری طرف جس مالی خستہ حالی محتاجی، ناداری اور رسوائی کو آخرت میں کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا ہے وہ قرآن کی رو سے خدا کا عذاب ہے (61/البقرۃ، 111,112/ال عمران، 152/الاعراف وغیرہ)۔

حیرت ہے کہ اختر علی یا مذہبی جماعت کو اتنی سی بات بھی سمجھ نہیں آتی کہ اگر اسلام اسلیے بھیجا گیا کہ لوگوں سے ''چلے'' کروائے جائیں تو پھر حضور اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ نے وہ قیامت خیز اذیتیں کس لیے اٹھائیں جن کے متعلق سوچ کر بھی دل دہل اٹھتا ہے؟ کیا مکہ سے ہجرت اسلیے کی گئی تھی کہ وہاں مسلمانوں کو وظیفے کرنے کی اجازت نہیں تھی؟ اگر قرآن

اسلیے نازل ہوا کہ اسکی آیات کو چلّوں اور وظیفوں میں استعمال کیا جائے تو پھر حضور اکرمؐ نے ایک حکومت کس لیے قائم کی؟ کیا مکہ اسلیے فتح کے گیا تھا کہ وہاں وظیفے اور چلے کیے جائیں؟ کیا آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ جس فرقانِ حمید کو (معاذ اللہ) جنتر منتر بنایا جا رہا ہے وہ دراصل اسلامی حکومت کا آئین ہوتا ہے؟ کیا آپ کو حجتہ الوداع کا وہ عہد ساز خطبہ بھی یاد نہیں جو نظام خداوندی کا خلاصہ ہے اور جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ رنگ و نسل کی بنیاد پر کسی ایک کو کسی دوسرے پر برتری حاصل نہیں۔ برتری اور فضیلت کا معیار اچھائی اور اہلیت (تقوی) ہے۔ تفرقے سے بچو۔ قرآن کو اپنا آئین مان کر عملی طور پر اس کی اطاعت کرو۔ دین میں غلو مت کرو۔ عورتوں کے ساتھ غیر منصفانہ رویہ مت اپناؤ۔

آپ خود ہی فرمائیے کہ نظامِ خداوندی کے ان بنیادی اصولوں میں سے کیا کوئی ایک بھی ایسا ہے جو دنیا کو ترک کر کے پورا کیا جا سکے؟ کیا ان تمام اصولوں کو پورا کرنے کی واحد صورت یہ نہیں کہ دنیا پر غلبہ حاصل کیا جائے؟ کیا تمام انبیاء کرام نے دنیا میں غلبہ حاصل نہیں کیا؟ حضرت علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا کہ

وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

غلام قوموں کے علم و عرفاں کی ہے یہی رمز آشکارا
زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے فضائے گردوں ہے بے کرانہ

قرآن ایک ''نظام زندگی'' ہے جسے اپنانے سے انسان کے جسم اور روح (یعنی

دنیا اور آخرت) دونوں میں تعمیر و ترقی پیدا ہوتی ہے، لیکن جس طرح بیج کی تعمیر و ترقی کیلئے ضروری ہے کہ وہ زرخیز مٹی، پانی، ہوا اور روشنی کے ساتھ مل جل کر رہے اسی طرح انسان کی تعمیر و ترقی کیلئے بھی ضروری ہے کہ وہ دنیا کے ساتھ مل جل کر رہے دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ جس طرح بیج کی تنہائی اسے پھل نہیں بنا سکتی اسی طرح انسان کی تنہائی بھی اسے مومن نہیں بنا سکتی۔

قرآن چاہتا ہے کہ انسان دنیا سے فوائد حاصل کرے (تاکہ اس کی دنیا اچھی ہو) اور پھر ان فوائد کو قرآن کی روشنی میں دوسروں کی فلاح و بہبود کیلئے عام کر دے (تاکہ اس کی آخرت بھی اچھی ہو)، اسی اصول کی بنیاد پر قرآن نوع انسانی کو تین درجوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

پہلے درجے پر وہ لوگ فائز ہیں جو دنیا سے خود بھی فوائد حاصل کرتے ہیں اور ان فوائد کو معاشرے کی فلاح و بہبود کیلئے بھی کھلا رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کی دنیا بھی اچھی ہوتی ہے اور آخرت بھی۔ قرآن انہیں ''مومن'' کے نام سے پکارتا ہے اور کہتا ہے کہ:

.... مومنین دنیا اور آخرت دونوں کی خوشگواریاں حاصل کرنے کے بارے میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں (219,220/البقرۃ)

.... مومنین کی کوشش (یعنی دعا) یہ ہوتی ہے کہ انہیں دنیا اور آخرت دونوں میں خوشگواریاں ملیں (201/البقرۃ، 156/الاعراف)

.... ان پر ارض و سما دونوں کے دروازے کھل جاتے ہیں (96/الاعراف)

.... ان پر دنیا اور آخرت دونوں میں خدا کی رحمت ہوتی ہے (14/النور)

.... انہیں دنیا اور آخرت دونوں میں خدا کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے

(101/یوسف)

. . . . انہیں دنیا اور آخرت دونوں میں خدا کی مدد ملتی ہے

(51/المومن،15/الحج)

....انہیں دنیا اور آخرت دونوں میں استحکام ملتا ہے(27/ابراھیم)

....انہیں دنیا اور آخرت دونوں میں انکے اچھے اعمال کا بدلہ ملتا ہے

(148/ال عمران)

.... انہیں دنیا اور آخرت دونوں میں خوشگواریاں نصیب ہوتی ہیں

(64/یونس،30/النحل،31/حم السجدۃ)۔

اسی لیے تو خدا کے آخری نبیؐ نے فرمایا کہ

....اگر تم میری دعوت کو اپنا لو گے تو یہ دنیا اور آخرت دونوں میں تمھاری خوش نصیبی ہوگی (البدایہ والنہایہ)

.... مومنین کے لیے دنیا اور آخرت دونوں کے فوائد ہیں (مسلم)

....(سب سے افضل دعا ہے کہ) دنیا اور آخرت کی عافیت مانگا کرو (ترمذی)

....جب تمھیں دنیا اور آخرت میں عافیت دی گئی تو تم (لوگ) کامیاب ہوئے (ترمذی)

دوسرے درجے میں وہ لوگ آتے ہیں جو دنیا سے خود تو فوائد حاصل کرتے ہیں لیکن ان فوائد کو قرآن کریم کی روشنی میں معاشرے کی فلاح و بہبود کیلئے کھلا نہیں رکھتے۔ان کی دنیا تو اچھی ہوتی ہے لیکن آخرت اچھی نہیں ہوتی۔انہیں قرآن ''کافر'' کہہ کر پکارتا ہے اور کہتا ہے کہ:

.... یہ لوگ دنیاوی زندگی اور اسکی زیب و زینت حاصل کرنے کی کوشش میں ہی لگے رہتے ہیں لہٰذا انہیں دنیا میں ہی انکے اعمال کا بدلہ مل جاتا ہے اور انکی حق تلفی نہیں ہوتی (15/ہود، 18/بنی اسرائیل، 20/الشوری)

.... یہ لوگ چند دن کے فائدے پر ہی خوش اور مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں (7/یونس، 30/ابراہیم، 7/الروم)

.... یہ لوگ اپنے جسم کی تعمیر و ترقی میں ہی لگے رہتے ہیں اور اپنی ذات کے بارے میں کچھ نہیں سوچتے۔ یہ لوگ عقل سے کام نہیں لیتے اور حیوانی سطح کی زندگی گزارتے ہیں (12/محمدؐ)

.... انہیں اسی کھیل کود میں مست رہنے دو یہاں تک کہ یہ اس دن (قیامت) کو دیکھ لیں جس کا وعدہ کیا گیا ہے (83/الزخرف، 3/الحجر)

.... انہیں تھوڑا سا ہنس لینے دو کیونکہ آخرت میں انہیں اپنا اعمال کے بدلے بہت رونا ہے (82/التوبۃ)

.... قیامت میں خدا ان سے کہے گا کہ تم اپنا حصہ دنیا میں لے چکے ہو اب جہنم میں جاؤ (20/الاحقاف)۔ (یہی ہے وہ آیت جس کی جانب اختر علی کو توجہ مبذول کرائی گئی تھی اور اس کے ساتھ جو روایت اسے سنائی گئی تھی اس کے بارے میں بھی آپ جان ہی چکے ہوں گے کہ وہ قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے، لہٰذا اسے درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا؟)

چنانچہ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ

خدا کافر کو اس کا بدلہ دنیا میں ہی دے دیتا ہے (مسلم)

اور تیسرے درجے کے لوگ وہ ہیں جو دنیا سے کوئی فائدہ اٹھاتے ہی نہیں۔ ظاہر ہے کے ایسے لوگوں کے پاس معاشرے کی فلاح و بہبود میں کھلا رکھنے کیلئے اپنا کچھ ہوتا ہی نہیں، ان لوگوں کی دنیا بھی بری ہوتی ہے اور آخرت بھی (124/طہ)۔ قرآن کے بقول:

.... ''ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں رسوائی ہو اور قیامت کے دن سخت عذاب میں ڈال دیے جائیں''

(85/البقرۃ وغیرہ)

.... (انہیں دنیا میں بھی تاریکی ملتی ہے اور آخرت میں بھی کہ) دنیا کے اندھے آخرت کے بھی اندھے ہوتے ہیں (72/بنی اسرائیل)

دنیا کو ترک کرنے والے لوگ اسی درجے میں آتے ہیں۔ لہٰذا حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم سے انکار کرنے والوں (یعنی رہبانیت اختیار کرنے والوں) کے بارے میں کہا گیا کہ انکے لیے دنیا اور آخرت دونوں کا عذاب ہے (55,56/ال عمران)۔

اب آیئے اختر علی کی طرف۔ تو آپ جان ہی چکے ہونگے کہ اس کی دکان اور فلاحی ادارہ دونوں کامیابی سے چل رہے تھے (یعنی جب وہ دنیا سے خود بھی فوائد حاصل کرتا تھا اور ان فوائد کو دوسروں کے لیے بھی کھلا رکھتا تھا) تو کن لوگوں میں شامل تھا اور جب دکان بھی ٹھپ ہوگئی اور فلاحی ادارہ بھی تو کن لوگوں میں شامل ہوگیا؟ خدا اختر علی پر بھی رحم کرے اور ان لوگوں پر بھی جن کے طفیل وہ اس حال تک پہنچا۔

کیا عورت مرد سے کم تر ہے

ایسا دل خراش منظر وقت کی آنکھ نے کہیں اور نہیں دیکھا ہوگا کہ جس بیٹی کی قبر کھودتے کھودتے باپ کے کپڑے گرد آلود ہوئے وہی بیٹی اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے باپ کے کپڑوں سے گرد جھاڑ رہی تھی لیکن معصومیت کی یہ انتہا بھی اس ننھی سی جان کو ظلم کی انتہا سے نہ بچا سکی اور وہ باپ کے ہاتھوں زندہ درگور ہوگئی۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیے کہ جب اس معصوم کو زبردستی قبر میں اتارا گیا ہوگا تو وہ کتنا روئی، گڑگڑائی چیخی اور چلائی ہوگی کہ خدا بھی پکار اُٹھا کہ:

''جب سورج لپیٹ لیا جائے گا، اور جب ستارے بے نور ہو کر بکھر جائیں گے، اور جب پہاڑ (غبار کی طرح) چلائے جائیں گے، اور جب دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں چُھٹی پھریں گی (انکی خبر گیری کرنے والا کوئی نہ ہوگا)، اور جب وحشی جانور (مارے خوف کے) اکٹھے ہو جائیں گے، اور جب سمندروں میں آگ بھڑکا دی جائے گی، اور جب روحیں بدنوں سے ملا دی جائیں گی، اور جب زندہ دفنائی گئی بچی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس جرم کی پاداش میں قتل کی گئی، اور جب اعمال نامے کھولے جائیں گے، اور جب آسمان کا پردہ ہٹا دیا جائے گا، اور جب جہنم دہکائی جائے گی، اور جب جنت قریب لائی جائے گی، جان لے گا ہر شخص کہ وہ کیا لے کر آیا ہے'' (التکویر 14-1)

کیا کوئی محشر میں کھڑا ہو کر یہ کہہ سکتا ہے کہ قتل ہونے والی کا قصور یہ تھا کہ ''وہ ایک لڑکی تھی''؟ آج کا انسان تو یہ کہہ کر اطمینان حاصل کر لیتا ہے کہ لڑکیوں کی زندہ درگوری تو عہد جہالت کا قصہ ہے لیکن کیا آج بھی اوپر تلے دو تین لڑکیوں کی پیدائش سے اچھے اچھوں کا چہرہ اتر نہیں جاتا؟ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ ماں بہن کی گالیاں تو لوگوں کا تکیہ کلام بن چکی ہیں لیکن باپ بھائی کی گالی کسی کی زبان پر بھولے سے بھی نہیں آتی؟ اور تو اور بیوی کے بہن بھائیوں کے لیے بولے جانے والے الفاظ (سالا اور سالی) بھی ہمارے معاشرے میں گالی کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں؟ کیا کسی نے یہ نہیں سوچا کہ بزدل اور بے غیرت مردوں کو چوڑیاں پہننے کا مشورہ کیوں دیا جاتا ہے جبکہ انہی چوڑیوں کے بغیر غیرت مند عورتیں بھی ادھوری سمجھی جاتی ہیں؟ کیا کسی نے اس پر بھی غور نہیں کیا کہ عورت کی ناک چھدوانے کا رواج کہاں سے چلا؟ کیا کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ نکیل جانوروں کو قابو میں رکھنے کے لیے ڈالی جاتی ہے؟ کیا کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ عہدِ جہالت کے بغداد میں جانوروں کی تجارت کرنے والوں کے لیے بولا جانے والا لفظ ''نخاس'' عورتوں کی تجارت کرنے والوں کے لیے بھی بولا جاتا تھا؟ کیا کسی کی نظر سے انیسویں صدی تک کے مغربی محققین کی یہ تحقیق بھی نہیں گزری کہ ''قدیم زمانے میں مرد نے سب سے پہلے جس جانور کو پالتو بنایا وہ عورت ہے''۔ ناقص العقل، ناقص الفطرت، فتنہ وفساد کی جڑ، برائی کی بنیاد، مکر وفریب کی پٹاری، شیطانیت کی تجسیم اور نجانے کیا کیا؟ پستی و کمتری کی شاید ہی کوئی اصطلاح ایسی ہو جو عورت سے منسوب نہ کی گئی ہو۔ اسی لئے تو فارسی زبان میں عورت کو ''زن'' یعنی مارنے کے لائق ہستی قرار دیا گیا۔

تاریخ گواہ ہے کہ کسی درندے نے بھی اپنی مادہ کے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک نہیں کیا جیسا مرد نے عورت کے ساتھ کیا۔ عورت کے بارے میں دنیا کی ہر قوم کے خیالات کم و

بیش ایک ہی جیسے فرسودہ ہیں۔فرق صرف اتنا ہے کہ باقی قومیں وہ کہتی ہیں جو ان کے صحیفوں میں لکھا ہے لیکن مسلمان وہ نہیں کہتے جو قرآن میں لکھا ہے۔

یہودیوں اور عیسائیوں کے یہاں عورت کو مرد سے کم تر اسلئے قرار دیا جاتا ہے کہ انکے صحیفوں کی رو سے ایک تو عورت کی پیدا ہی مرد کا دل بہلانے کیلئے کیا گیا اور دوسرا عورت کی پیدائش کا طریقہ مرد کی پیدائش کے طریقے سے کم تر ہے۔توریت میں لکھا ہے کہ ''آدم اپنی تنہائی سے اداس رہنے لگا تھا لہذا خدا نے اس کی پسلی سے حوا (یہ لفظ قرآن میں نہیں) کو پیدا کیا تا کہ وہ اس کا دل بہلاتی رہے'' (پیدائش 25-2/21) اور ان لوگوں کے نزدیک عورت قابل نفرت اسلئے ہے کہ توریت ہی کے بقول ''عورت ابلیس کا پیکر ہے کیونکہ اسی نے آدم کو جنت سے نکلوایا'' (پیدائش 13-3/8)۔

لیکن قرآن بڑے واضح الفاظ میں ان فرسودہ عقائد کی تردید کرتے ہوئے ایک طرف تو یہ کہتا ہے کہ ایک ہی جرثومہء حیات سے دنیا میں مردوں اور عورتوں کو پھیلا دیا (1/النساء) یعنی جس طرح عورت کو پیدا کیا گیا بالکل اسی طرح مرد کو بھی پیدا کیا گیا اور دوسری طرف جنت سے نکالے جانے کیلئے عورت اور مرد (دونوں) کو برابر کا قصوروار ٹھہراتا ہے (**فاز لهما الشيطن**) کہ دونوں براہ راست شیطان کے بہکاوے میں آئے۔

(36/البقرہ)

قرآن مرد اور عورت کو (میاں بیوں کی حیثیت سے) ایک دوسرے کا لباس قرار دیتا ہے (187/البقرۃ) لیکن اس کے باوجود مسلمانوں میں بھی یہ عقیدہ عام ہے کہ عورت مرد سے کمتر ہے۔اور تو اور رحمتِ عالمؐ سے بھی اس قسم کی درجنوں روایات منسوب کی جاتی ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ:

.....نجوست تین چیزوں میں ہے گھر، گھوڑا اور عورت (بخاری)

.....کتے، گدھے اور عورت کے سوا کوئی چیز نماز نہیں توڑتی (ترمذی)

.....عورت کے وضو سے بچا ہوا پانی مکروہ ہے (ترمذی)

امام ترمذیؒ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کسی کے کپڑے بچے کے پیشاب سے ناپاک ہو جائیں تو ''کئی صحابہؓ، تابعین اور اُن کے بعض فقہا مثلاً امام احمد اور امام اسحاق وغیرہ کا بھی یہی قول ہے کہ شیر خوار بچے کا پیشاب معمولی دھویا جائے اور بچی کا اچھی طرح دھویا جائے'' (ترمذی)

آپ خود ہی سوچیے کہ کیا حضور اکرمؐ عورت کو کتے اور گدھے کے برابر قرار دے سکتے ہیں، جبکہ آپؐ عورت کا اسقدر احترام کرتے تھے کہ حضرت عائشہؓ کے بقول ''حضرت فاطمہؓ کے تشریف لانے پر کھڑے ہو جاتے، انھیں چومتے اور اپنی جگہ بٹھاتے'' (ترمذی)؟ حضور اکرمؐ کے یہ ارشاداتِ مبارک تو عام نے بھی سنے ہونگے کہ

.....خدیجہ کی محبت مجھے خاص طور پر عطا کی گئی ہے'' (مسلم)

.....''فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے'' (ترمذی)

کیا حضرت خدیجہؓ اور حضرت فاطمہؓ عورتیں نہیں تھیں؟ فکری خستہ حالی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ جن لوگوں کے بقول حضور اکرمؐ نے عورت کو منحوس کہا وہی حضرات اس بات کو بھی اپنے ایمان کا حصہ قرار دیتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ ''جنت ماں کے پاؤں تلے ہے''۔ کیا ماں عورت نہیں ہوتی؟ اور کیا یہ بھی ممکن ہے کہ حضور اکرمؐ بیک وقت عورت کو منحوس بھی کہیں اور یہ بھی کہیں کہ عورت کے قدموں کے نیچے جنت ہے؟

حضرت علامہ اقبالؒ کے بقول:

''ذرا سوچنے کا مقام ہے کہ جس نبیؐ نے نوع انسانی کے ایک بہت
بڑے گروہ یعنی غلاموں کو حقوق کی رو سے آقاؤں کے مساوی کر دیا،

یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہی نبیؐ نوع انسانی کے ایک نہایت ضروری حصے (عورت) کو جسے اس نے اپنی تین محبوب ترین چیزوں (عورت، پاکیزگی اور صلوۃ) میں شامل کیا، کو غلاموں کی صورت منتقل کر دیتا''

(اقبال اور عورت۔ صفحہ 87)

حضور اکرمؐ مرد اور عورت کی مساوات کے اسقدر قائل تھے کہ حضرت عائشہؓ کے بقول آپؐ ازواجِ مطہرات کے کام اپنے ہاتھ سے کیا کرتے تھے (بخاری)۔ جب قرآن کریم مرد اور عورت کو برابر قرار دیتا ہے تو پھر حضور اکرمؐ (جو چلتا پھرتا قرآن تھے) عورت کو مرد سے کمتر کیسے قرار دے سکتے ہیں؟

کون نہیں جانتا کہ حضور اکرمؐ کی ساری زندگی (قرآن ہی کے بقول) قرآن کی اطاعت میں گزری (50,106/الانعام، 203الاعراف، 15,109/یونس وغیرہ) یعنی حضور اکرمؐ نے جو کچھ بھی کہا یا کیا وہ قرآن ہی کی تائید میں کہا اور کیا؟ تو کیا کوئی ایسی حدیث جو قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے، حضور اکرمؐ کا فرمان ہوسکتی ہے (چاہے وہ حدیث کسی سے بھی روایت کیوں نہ کی گئی ہو)؟ کیا اس بات کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ حضور اکرمؐ کی کوئی بات قرآنِ کریم کے خلاف ہوسکتی ہے؟

حضور اکرمؐ کے نزدیک عورت کا مقام کیا تھا اس کا اندازہ ان احادیثِ مبارکہ سے بخوبی کیا جا سکتا ہے جو قرآنی تعلیمات کے عین مطابق ہیں مثلاً:

.....جس کی بیٹی ہو وہ اسے زندہ درگور نہ کرے، نہ اُسے ذلیل کرے نہ اپنے بیٹے کو اُس پر ترجیح دے اللہ تعالیٰ اُسے جنت میں داخل فرمائے گا (ابوداؤد۔ مشکوۃ)۔

.....کیا میں تمہیں بہترین صدقہ بتاؤں؟ تمہاری وہ بیٹی جو تمہاری

طرف لوٹا دی گئی ہو اور تمہارے سوا اسکے لئے کوئی کمانے والا نہ ہو (ابوداؤد۔ مشکوۃ)۔

.....جو دو بیٹیوں کی (احسن طور پر) پرورش کرے، یہاں تک کہ وہ سن بلوغ کو پہنچ جائیں تو قیامت کے روز حاضر ہوگا کہ میں اور وہ اس طرح ہونگے اور (حضورؐ نے) اپنی دونوں انگلیوں کو ملایا (مسلم۔ مشکوۃ)

.....ایک شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہؐ میرے حسن سلوک کا زیادہ حقدار کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا تیری ماں۔ پھر تیری ماں۔ پھر تیری ماں۔ پھر تیرا باپ (مسلم)

.....تم میں بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں کے ساتھ بہتر ہے (ابن ماجہ)

.....عورتوں کی عزت، عزت والا ہی کرتا ہے اور ان سے توہین آمیز سلوک وہی کرتا ہے جو خود کمینہ ہو (کنز العمال)

بات یہ ہے کہ اسلام کے دشمنوں نے مسلمانوں کو قرآن وسنت کی حقیقی تعلیم سے دور کرنے کے لئے پہلے اپنے مفادات کے تحت روایات مرتب کیں، پھر ان ضعیف روایات کو حضور اکرمؐ سے منسوب کیا اور پھر ان روایات کی روشنی میں قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے کا عقیدہ عام کر دیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج مسلمان قرآن کی روشنی میں روایات کو پڑھنے کے بجائے روایات کی روشنی میں قرآن کو پڑھتے ہیں۔ ایک آیت (**الرجال قوامون علی النساء**) کا ترجمہ کچھ اس طرح کیا جاتا ہے کہ ''مرد عورتوں پر حاکم ومسلط (قوامون) ہیں'' (34النساء)

کیا اس ترجمے کو درست تسلیم کر لینے سے (معاذ اللہ) قرآن میں تضاد پیدا

نہیں ہو جاتا ہے کہ قرآن ایک طرف تو یہ کہتا ہے کہ

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں (71/التوبۃ)

اور دوسری طرف یہ کہتا ہے کہ

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے کتاب، حکومت اور
نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ خدا کے احکام کی جگہ
میرے احکام کی اطاعت کرو (79/ال عمران)

یعنی (کوئی عام انسان تو دور کی بات) کسی نبی کو بھی اس بات کا اختیار حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے کیونکہ قرآن کی رو سے حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے وہ اس لیے کہ

خدا سب کا تنہا حاکم ہے (108/الانبیاء) اور خدا اپنی حکومت میں
کسی کو شریک نہیں کرتا (26/الکھف)؟

اور قرآن میں تضاد پیدا کرنا کیا یہ ثابت کرنے کے مترادف نہیں کہ (نعوذ باللہ) قرآن خدا کی کتاب ہی نہیں کیونکہ قرآن ہی کے بقول اگر قرآن خدا کی کتاب نہیں ہوتی تو اس میں تضاد پایا جاتا (82/النساء)؟

قوامون کا ترجمہ ''حاکم و مسلط اسلئے کیا جاتا ہے کہ روایات میں اس کا مفہوم ''مسیطرین''، یعنی ''دررونغے'' اور متسلطین ''عورتوں پر مسلط کیے گئے'' ہے (تفاسیر کشاف و جلالین)۔ ورنہ لغت (لسان العرب، تاج العروس وغیرہ) میں ''قوامون (ق۔و۔م)'' کا مطلب ہے ''کفالت کرنے والے''۔

مذکورہ آیت کا درست مفہوم یہ ہوگا کہ مرد عورتوں کے کفیل ہیں وہ اس طرح کہ قرآنی تقسیم کار کی رو سے مردوں پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ عورتوں کی ضروریاتِ زندگی

پوری کریں کیونکہ عورتیں اپنے خاص فرائض کی انجام دہی کے دوران اکتسابِ رزق سے معذور ہو جاتی ہیں۔لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ عورتیں اکتسابِ رزق کر ہی سکتیں۔ قرآن عورتوں کو بھی اکتسابِ رزق کی اجازت دیتا ہے(32/النساء)لیکن ''قوامون'' والی آیت سے ظاہر ہے کہ یہ اجازت مخصوص حالات کیلئے ہی ہوسکتی ہے۔

زیرِ بحث آیت کے بارے میں حضرت علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں کہ:

''مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اسلام میں مرد اور عورت کی قطعی مساوات ہے۔بعض علماء مرد کی فوقیت کے قائل ہیں،جس آیت سے شک کیا جاتا ہے وہ مشہور ہے'الرجال قوامون علی النساء'۔عربی محاورے کی رو سے اسکی یہ تفسیر صحیح معلوم نہیں ہوتی'' (اقبال اور عورت۔ص ۸۷)''اگر آپ ان حقوق پر نظر ڈالیں جو اسلام نے عورتوں کو دیے ہیں تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ اس مذہب نے عورت کو کسی طرح بھی مرد سے ادنیٰ نہیں رکھا'' (ایضاص۹۰)

اسی آیت کے آخری ٹکڑے میں ہے کہ:

زبانی تنبیہہ کے باوجود عورتیں سرکشی (قرآن کی نافرمانی) کریں تو انہیں نظر بند کر دو۔ پھر بھی باز نہ آئیں تو انہیں جسمانی سزا دو (34/النساء)

اور اس کا مطلب یہ نکالا جاتا ہے کہ اگر عورتیں اپنے شوہروں کی نافرمانی کریں تو شوہر انھیں مار بھی سکتے ہیں۔ یہ مفہوم بھی درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یہاں بات میاں بیوی کی ہو ہی نہیں رہی بلکہ عام مردوں (الرجال) اور عام عورتوں (النساء) کی ہو رہی ہے۔یعنی یہ حکم عائلی زندگی کے متعلق ہے ہی نہیں بلکہ معاشرتی زندگی کے متعلق ہے اور

معاشرتی زندگی میں کسی کو سزا دینا کسی فرد کا کام نہیں بلکہ عدالت کا کام ہے۔ مثال کے طور پر قرآن میں جہاں یہ لکھا ہے کہ ''چور مرد اور چور عورت کے ہاتھ کاٹ ڈالو'' (38/المائدہ) ''زانی مرد اور زانی عورت کو ایک ایک سو کوڑے مارو'' (2/النور) تو کیا اس سے یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ جس شخص کے ہاتھ بھی کوئی چور لگے وہ اپنے طور پر ہی اسکے ہاتھ کاٹ دے یا جس کسی کو بھی کوئی زانی ملے وہ از خود ہی اسے سو کوڑے لگا دے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان آیات میں ''کاٹ ڈالو'' اور ''مارو'' کا تخاطب عدالت کی طرف ہے۔ بالکل اسی طرح سرکش عورتوں کو سزا دینا بھی عدالت ہی کی ذمہ داری ہے۔ رہا یہ سوال کہ سرکش عورتوں کو ہی سزا دینے کا حکم کیوں دیا گیا تو بات یہ ہے کہ یہاں زیرِ بحث ہی عورتیں ہیں ورنہ قرآن سرکش مردوں کو بھی معاف نہیں کرتا (43/طہ)

عورت کو مرد سے کم تر ثابت کرنے کیلئے ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ
اگر کوئی مر جائے اور اس کے ترکے میں بیٹے کا حصہ بیٹی کے مقابلے
میں دگنا ہوتا ہے (11/النساء)
لیکن اسی آیت میں یہ بھی تو لکھا ہے کہ
اگر میت کی اولاد ہو تو اس کے ماں باپ کا حصہ برابر ہوگا اور اگر اولاد
نہ ہو تو ماں کا حصہ باپ کے مقابلے میں دگنا ہوگا (11/النساء)؟

کیا ''ماں'' عورت نہیں ہوتی یا ''باپ'' مرد نہیں ہوتا؟ بات یہ ہے کہ قرآن نے وراثت میں مرد اور عورت کا حصہ مختلف حیثیتوں میں انکی مالی اور معاشرتی حالت کو سامنے رکھتے ہوئے مقرر کیا ہے اور اس سے یہ طے نہیں کیا جا سکتا کہ کون افضل اور کون کم تر ہے۔

ایک نکتہ یہ بھی نکالا جاتا ہے کہ ایک مرد کی گواہی دو عورتوں کے برابر ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کہتا ہے کہ

جب آپس میں قرض کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو.... پھر اس پر دو مردوں کو گواہ بنا لیا کرو۔ اور اگر دو مرد نہ مل سکیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنا لیا کرو تا کہ اگر ایک عورت الجھن میں پڑ جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے (282/البقرہ)

اس بارے میں درج ذیل چار باتوں پر توجہ دیجیے:

.... پہلی یہ کہ خدا نے یہ نہیں کہا کہ دونوں عورتوں سے الگ الگ گواہی لی جائے۔ گواہی تو ایک ہی عورت نے دینی ہے۔ ہاں اگر وہ الجھن کا شکار ہو جائے تو دوسری کا کام اسے یاد دلانا ہے لیکن اگر وہ الجھن کا شکار ہی نہ ہو تو ظاہر ہے کہ دوسری عورت کے بولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

.... دوسری بات یہ ہے کہ یہ حکم صرف قرض کے لین دین سے متعلق ہے ورنہ دیگر معاملات میں گواہی کیلئے مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں یعنی ایک مرد کی گواہی ایک ہی عورت کے برابر ہے (4/النور، 156/النساء، 106/المائدہ، 2/الطلاق)

.... تیسری بات یہ کہ اسلامی معاشرے میں اکتسابِ رزق عام طور پر عورت کے ذمے نہیں ہوتا لہذا مالی معاملات میں عورت کا الجھن میں گرفتار ہونا کوئی عجیب بات نہیں۔

....اور چوتھی بات یہ کہ اگر عورت کی تربیت ایسی ہو جائے کہ اس بات کا کوئی اندیشہ ہی نہ رہے کہ وہ الجھن کا شکار ہو گی تو دوسری عورت کی موجودگی کی ضرورت ہی نہیں رہے گی بالکل ایسے ہی جیسے پانی

میسر آجائے تو تیمّم کا حکم ساقط العمل ہو جاتا ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرآن میں لکھا ہے کہ ''عورتوں کی چال بڑی گہری ہوتی ہے'' (28/یوسف) لیکن قرآن میں یہ بھی تو لکھا ہے کہ یہ قول خدا کا نہیں بلکہ زلیخا کے شوہر کا ہے (27-25/یوسف) جو اس نے (یوسفؑ اور زلیخہ کے واقعہ میں) زلیخہ کی چال بازی پر (دنیا بھر کی عورتوں کے لیے نہیں کہا تھا بلکہ) زلیخہ کیلئے کہا تھا۔

ایک آیت کا یہ ٹکڑا بھی پیش کیا جاتا ہے کہ

مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ حاصل ہے (228/البقرہ)

لیکن پوری آیت کیا یوں نہیں کہ

مردوں پر عورتوں کے حقوق (بالکل) ویسے ہی ہیں جیسے عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں۔ البتہ مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ حاصل ہے وہ یہ کہ (مردوں کی عدت نہیں ہوتی جب کہ) عورتوں کی عدت ہوتی ہے (228/البقرہ)؟

لیکن عورتوں کو بھی تو مردوں پر ایک درجہ حاصل ہے۔ وہ یہ کہ قرآن نکاح کے وقت عورت پر ''جہیز'' کی شرط تو عائد نہیں کرتا لیکن مرد پر ''مہر'' کی شرط ضرور عائد کرتا ہے (4,20,24/النساء 236,237/البقرہ)؟

قرآن کے مطابق سیرت و کردار کا کوئی ایک گوشہ بھی ایسا نہیں جس میں عورت اور مرد ہم مقام و ہم قدم نہ ہوں۔ یہ آیات دیکھیے کہ:

قرآن کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے والے مرد اور عورتیں (المسلمین و المسلمت) قرآن پر دل و دماغ کی گہرائی اور سچائی سے یقین رکھنے والے مرد اور عورتیں (المومنین والمومنات) قرآن کی روشنی میں اپنی

صلاحیتیں استعمال کرنے والے مرد اور عورتیں (والقنتین والقنت) خدا سے کیا ہوا وعدہ سچ کر کے دکھانے والے مرد اور عورتیں (والصدقین والصدقت۔ تفصیل دیکھئے 111/التوبۃ) خدا کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات میں ثابت قدم اور مستحکم رہنے والے مرد اور عورتیں (والصبرین والصبرت) نوع انسانی کی خدمت کے لئے ثمر دار ٹہنی کی طرح جھکنے والے مرد اور عورتیں (والخشعین والخشعت) اپنی ہر متاع نظامِ خداوندی پر نچھاور کرنے والے مرد اور عورتیں (والمتصدقین والمتصدقت) خدا کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں کا ہر طرح سے خیال رکھنے والے مرد اور عورتیں (والصائمین والصٰئمت) اپنی عفت و آبرو کی پوری پوری حفاظت کرنے والے مرد اور عورتیں (والحفظین فروجھم والحفظت) زندگی کے ہر قدم پر قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھنے والے مرد اور عورتیں (والذکرین اللہ کثیرا والذکرات) بے شک ان (مردوں اور عورتوں) کے لئے خدا نے مغفرت اور اجر تیار کر رکھا ہے (35/الاحزاب) خدا کسی عمل کرنے والے مرد یا عورت کا اجر ضائع نہیں کرتا (195/ال عمران، 124/النساء)۔

قرآن عورت اور مرد کو ایک دوسرے کا زوج (یعنی ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم) قرار دیتا ہے (11/الشوری، 21/الروم) کیونکہ ''وہ ایک دوسرے میں سے ہیں'' (195/ال عمران) فرق صرف اتنا ہے کہ تقسیمِ کار کے اصول کے مطابق عورت کے ذمے ایک کام ہے تو مرد کے ذمے دوسرا۔ بالکل ایسے ہی جیسے کان کا کام سننا اور آنکھ کا کام

دیکھنا ہے۔تو کیا کان کو آنکھ یا آنکھ کو کان سے افضل قرار دیا جا سکتا ہے؟

حضرت علامہ اقبالؒ کے بقول

''عورت کے بحیثیت عورت اور مرد کے بحیثیت مرد بعض خاص علیحدہ علیحدہ فرائض ہیں۔ان فرائض میں اختلاف ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ عورت ادنیٰ ہے اور مرد اعلیٰ۔فرائض کا اختلاف اور وجوہ پر مبنی ہے .....مطلب یہ ہے کہ جہاں تک مساوات کا تعلق ہے تو اسلام کے اندر مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں''

(اقبال اور عورت۔ص ۸۸)

یہ بات دل و دماغ پر نقش کر لینی چاہیے کہ مرد کو مرد ہونے کی بنا پر عورت سے افضل قرار دینا دراصل احکام الٰہی کو جھٹلانے کے مترادف ہے کیونکہ قرآن کے مطابق پیدائش کے اعتبار سے ہر انسان (خواہ وہ مرد ہو یا عورت) یکساں طور پر واجب التکریم ہے (70/بنی اسرائیل) اور خدا کے نزدیک فضیلت کا معیار صرف اور صرف تقوی ہے (13/الحجرات)۔

اسی لیے تو حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ

.....اللہ کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے جو متقی ہے (بخاری)

.....اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے (مسلم)

دل کے اندھے

کیا آپ جانتے ہیں کہ اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق وہ لوگ ہیں جو عقل وفکر سے کام نہیں لیتے (22/الانفال) لوگوں کی ایک کثیر تعداد اسی زمرے میں شامل ہے اور یہ لوگ جس روش پر چل رہے ہیں وہ سیدھی جہنم میں جاتی ہے۔ان کی روش یہ ہے کہ ان کے پاس سوچنے کی صلاحیت ہے لیکن یہ اس سے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ان کے پاس دیکھنے کی صلاحیت ہے لیکن یہ اس سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ان کے پاس سننے کی صلاحیت ہے لیکن یہ اس سے سننے کا کام نہیں لیتے۔یہ لوگ حیوانوں کی طرح ہیں بلکہ حیوانوں سے بھی بدتر (حیوانوں کی طرح اس لیے کہ حیوان بھی غور وفکر سے خالی ہوتے ہیں اور حیوانوں سے بھی بدتر اس لیے کہ حیوانوں کے برعکس انہیں عقل ملی لیکن یہ پھر بھی نہ سوچتے ہیں نہ سمجھتے ہیں) یہی وہ لوگ ہیں جو غفلت کی زندگی گزار رہے ہیں (179/الاعراف)۔

جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ قرآن کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اس روش کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا (170/البقرۃ) اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ اگر تمھارے باپ دادا نے عقل سے کام نہ لیا ہو اور وہ سیدھے راستے پر نہ ہوں تو کیا پھر بھی انہی کی پیروی کرتے رہو گے (104/المائدۃ، 170/البقرۃ) تو جواب دیتے ہیں کہ ہاں پھر بھی انہی کی پیروی کرتے رہیں گے کیونکہ ہماری تسلی کے لئے یہی کافی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں (104/المائدہ)۔

ان کی اور ان کے باپ دادا کی مثال یوں ہے جیسے جانوروں کے ریوڑ اور ان کے

پیچھے چرواہے۔ چرواہوں نے اپنے باپ دادا سے (الفاظ کے بغیر کچھ آوازیں اور مطلب کے بغیر کچھ الفاظ یعنی) کچھ پکارے اور کچھ اشارے سیکھ رکھے ہیں جن سے وہ جانوروں کو ہانکتے رہتے ہیں۔ نہ چرواہوں کو علم ہے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں نہ جانوروں کو معلوم ہے کہ وہ کیا سن رہے ہیں لیکن جانور کیونکہ ان آوازوں اور اشاروں کے عادی ہو چکے ہیں لہٰذا وہ سوچے سمجھے بغیر کبھی ایک طرف مڑ جاتے ہیں اور کبھی دوسری طرف۔ یہ لوگ بہرے ہیں ' گونگے ہیں' اندھے ہیں۔ ان کا عقل و دانش سے کوئی تعلق نہیں (171/البقرۃ)۔

یہ لوگ اپنے پیشواؤں اور رہنماؤں سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی خدا سے کرنی چاہئے (165/البقرۃ) دوزخ جوش کے مارے پھٹ پڑے گی جب ان کی کوئی جماعت اس میں ڈالی جائے گی تو دوزخ کے داروغہ ان سے پوچھیں گے کہ کیا تمھارے پاس کوئی آگاہ کرنے والا نہیں آیا تھا۔ یہ کہیں گے کہ ضرور آیا تھا لیکن ہم نے اسے جھٹلا دیا (8,9/الملک) کوئی قوم ایسی نہیں جس کی طرف کوئی آگاہ کرنے والا نہ بھیجا گیا ہو لیکن ہر قوم کے 'مترفین' (دوسروں کی کمائی پر پلنے والے تن آسان وخوشحال طبقے) نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک راہ پر چلتے ہوئے پایا اور ہم بھی انہی کے نقش قدم پر چلیں گے (23/الزخرف)۔

حضرت نوحؑ نے کہا کہ ایک خدا کے سوا کوئی اس لائق نہیں کہ اسکی محکوی و اطاعت کی جائے (23/المومنون) (جواب ملا کہ ہم تمھاری بات نہیں مان سکتے اس لئے نہیں کہ تمھاری بات غلط ہے بلکہ اس لئے کہ) ہم نے یہ بات اپنے باپ دادا میں سے کسی سے نہیں سنی (24/المومنون)۔

حضرت صالحؑ نے بھی یہی کہا کہ سوائے ایک خدا کے کسی کی محکوی و اطاعت اختیار نہ کرو (61/ھود) (جواب پھر وہی آیا کہ) کیا تم ہمیں ان چیزوں کو پوجنے سے منع

کرتے ہو جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے آئے (62/ھود)۔

حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ ان بتوں کی کیا حیثیت ہے جنہیں تم نے معبود بنا رکھا ہے (52/الانبیاء) (جواب پھر وہی ملا کہ) ہمیں انکی حیثیت سے کیا مطلب ہم تو انہیں اس لیے پوجتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو انکی پرستش کرتے دیکھا ہے (53/الانبیاء)

حضرت شعیبؑ نے بھی پرانی والی بات ہی کہی کہ سوائے ایک خدا کہ کوئی اس قابل نہیں کہ اسکی محکومی و اطاعت کی جائے (84/ھود) (جواب بھی پرانا والا ہی ملا کہ) کیا ہم انکی پرستش چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے آئے (87/ھود)

حضرت موسیٰؑ سے بھی یہی کہا گیا کہ کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہمیں اس راہ سے پھیر دو جس پر ہمارے باپ دادا چلتے رہے (78/یونس)

اور حضرت محمدؐ کے بارے میں بھی یہی کہا گیا کہ یہ شخص چاہتا ہے کہ جن چیزوں کو تمھارے باپ دادا پوجتے آئے تمھیں ان سے روک دے (43/سبا)۔

(نبوت تو نبی ءاکرمؐ پر ختم کر دی گئی لیکن اندھی تقلید کے پجاری آج بھی موجود ہیں، یہ حضرات خدا اور رسولؐ کو قرآن کی روشنی میں جانے اور ماننے کے بجائے روایات کی روشنی میں جانتے اور مانتے ہیں، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اپنے آپ کو خدا اور رسولؐ کے مطابق بنانے کے بجائے خدا و رسولؐ کو اپنے مطابق بنانے کی جدوجہد میں مشغول ہیں۔ انہیں سیدھا راستہ دکھانے کی کوشش کی جائے تو آج بھی ان کا جواب یہی ہوتا ہے کہ ہم تمھاری بات کیسے مان لیں کہ ''ہم نے یہ بات اپنے باپ دادا میں سے کسی سے نہیں سنی''۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے جس چیز کو نادانی میں جھٹلا دیا اسکے علم پر یہ قابو ہی نہیں پا سکے اور اسکی اصلیت ان پر کھلی ہی نہیں۔ ان سے پہلے لوگوں نے بھی ایسے ہی احکام الٰہی کی تکذیب کی تھی (39/یونس)۔

قیامت کے روز خدا ان سے پوچھے گا کہ تم میری آیتوں کو کس بنیاد پر جھٹلاتے تھے جبکہ تم نے علمی طور پر ان کا احاطہ ہی نہیں کیا تھا (84/النمل) اور انکے ظلم کے سبب انکے حق میں عذاب کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا اور یہ بول بھی نہیں سکیں گے (85/النمل)۔

(تب ان کا اور ان کے بڑے بوڑھوں کا جھگڑا شروع ہو جائے گا۔ یہ کہیں گے کہ) ہم خدا کے بجائے تمھاری پیروی کیا کرتے تھے۔ کیا تم ہمیں خدا کے عذاب سے نہیں بچاؤ گے وہ جواب دیں گے کہ اگر ہمیں اس عذاب سے بچنے کی کوئی صورت دکھائی دیتی تو تمھیں بھی دکھا دیتے لیکن اس عذاب سے نہ ہمارا بچنا ممکن ہے نہ تمھارا (21/ابراہیم)۔ یہ کہیں گے کہ اگر تم نہیں ہوتے تو ہم صحیح راستے پر چلتے اور ضرور مومن ہو جاتے (31/سبا) بڑے بوڑھے جواب دیں گے کہ ہم نے تمھارے ساتھ کوئی زبردستی تو نہیں کی تھی تم تو اپنی مرضی سے ہمارے پیچھے چلتے تھے۔ تمھارا اپنا قصور ہے (32/سبا) اور یہ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے بڑے بوڑھوں کو دگنا عذاب دے کہ ایک تو یہ خود گمراہ ہوئے دوسرا انہوں نے ہمیں گمراہ کیا (68/الاحزاب، 38/الاعراف) اور خدا کہے گا کہ تم سب کو دگنا عذاب ملے گا (38/الاعراف)۔

ان لوگوں کے لئے دہکتی ہوئی آگ کا عذاب تیار کیا گیا ہے (5/الملک) جس میں انہیں ہمیشہ کے لیے ڈال دیا جائے گا (65/الاحزاب) اور یہ لوگ کہیں گے کہ اگر ہم عقل وفکر سے کام لیتے تو آج جہنم میں کیوں ہوتے (10/الملک)؟ ہم نے (سوچے سمجھے بغیر) اپنے بڑے بوڑھوں کا کہنا مانا تو انہوں نے ہمیں گمراہ کر دیا (67/الاحزاب) دراصل ان لوگوں کے آئیڈیل ان کے باپ دادا ہیں اور وہ بھٹکے ہوئے تھے سو یہ بھی بھٹک گئے (69,70/الصفت)۔

کاش کہ یہ ظالم لوگ جو بات عذاب کے وقت سمجھیں گے اب سمجھ لیتے

(165/البقرۃ) لیکن ان کے دلوں پر تو مہریں لگ چکی ہیں کیونکہ یہ اپنے جذبات کے پیچھے چل رہے ہیں (16/محمدؐ) یعنی ان کے اپنے اعمال ہی زنگ بن کر ان کے دلوں پر لگ گئے ہیں (14/المطففین)۔

کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے ایک دوسرے کے برابر ہو سکتے ہیں (9/الزمر) اندھا اور آنکھوں والا کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ نہ ہی اندھیرا اور روشنی ایک جیسے ہو سکتے ہیں۔ نہ ہی دھوپ اور سایہ۔ نہ ہی زندہ اور مردہ برابر ہو سکتے ہیں (19-22/فاطر)۔ انہیں سمجھانا نہ سمجھانا برابر ہے (10/یس) کہ نصیحت تو وہ لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل وفکر سے کام لیتے ہیں (9/الزمر) لیکن یہ تو عقل وفکر سے کام لینے والے نہیں (42/یونس) ان کے دلوں پر تو تالے پڑے ہوئے ہیں (24/محمد) دراصل یہ لوگ آنکھوں کے اندھے نہیں بلکہ دل کے اندھے ہیں (46/الحج)۔

صرف ایک بات

اندھی روایات اور اندھی روایت پرستی ہمیں قرآن وسنت سے کتنا دور لے آئی ہے کہ ایمان کی باتیں کفر کی باتیں اور کفر کی باتیں ایمان کی باتیں لگنے لگی ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے یہاں اگر کوئی یہ کہہ دے کہ ''وہ (اور تو اور) خدا کے احکام بھی دیکھے سنے (یعنی سوچے سمجھے) بغیر نہیں مان سکتا'' تو اس سے بڑھکر کفر کی بات اور کیا ہوگی؟ جبکہ قرآن اسے ایمان کی بات قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ

''یہ (مومنین) وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے خدا کی آیات بھی پیش کی جائیں تو وہ ان پر بھی اندھے اور بہرے بن کر نہیں گرتے''

(73/الفرقان)

اور اگر کوئی یہ کہہ دے کہ ''وہ خدا کا ہر حکم آنکھیں بند کر کے ماننے کے لیے تیار ہے'' تو اس سے بڑی ایمان کی بات اور کیا ہوگی؟ جبکہ قرآن کا اظہار یہ ہے کہ

''بے شک خدا کے نزدیک بدترین مخلوق وہ لوگ ہیں جو بہرے اور گونگے بنے رہتے ہیں اور عقل سے کام نہیں لیتے'' (22/الانفال)

عام طور پر بتایا جاتا ہے ایمان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ عقل ہے جبکہ قرآن سب سے زیادہ زور عقل کے استعمال پر دیتا ہے، ساڑھے سات سو کے لگ بھگ آیات ایسی ہیں جن میں عقل کے استعمال کی تلقین کی گئی اور ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں عقل کے استعمال پر پابندی لگائی گئی ہو؟

قرآن میں ایک مقام پر آیا ہے کہ

خدا کے نزدیک بدترین مخلوق وہ لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے (22/الانفال)

اور دوسرے مقام پر آیا ہے کہ

خدا کے نزدیک بدترین مخلوق وہ لوگ ہیں جو ایمان نہیں لاتے (55/الانفال)

ان دونوں آیات کو ذہن میں رکھیے اور اس سیدھے سادے سے سوال کا جواب دیجئے کہ اگر ''الف'' ''ب'' کے بھی برابر ہو اور ''ت'' کے بھی، تو کیا ''ب'' اور ''ت'' بھی برابر نہیں ہوں گے؟ بدترین مخلوق ''الف'' برابر ہے عقل سے کام نہ لینے والے ''ب''، بدترین مخلوق ''الف'' برابر ہے ایمان نہ لانے والے ''ت''، تو اس کا مطلب کیا یہی نہیں ہوا کہ خدا کے نزدیک عقل سے کام نہ لینا یا کفر کرنا ایک ہی بات ہے؟

اسی لیے تو حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ

''اللہ تعالیٰ نے جب عقل کو پیدا کیا تو اس سے فرمایا کہ میں نے کوئی مخلوق تجھ سے بہتر، افضل اور خوبصورت پیدا نہیں کی۔ میں تیرے سبب لوں گا، تیرے سبب دوں گا، تیرے سبب پہنچانا جاؤں گا، تیرے سبب ناراض ہوں گا، تیرے سبب ثواب ہوگا اور تجھ پر ہی عذاب ہوگا'' (مشکوۃ۔ کتاب الاذان)

قرآن میں اتنی مرتبہ صلوۃ کا حکم بھی نہیں آیا جتنی مرتبہ عقل و دانش کو بروئے کار لانے کی ہدایت کی گئی، تو کیا آپ کے ذہن میں کبھی یہ سوال نہیں اٹھا کہ ''اقیم الصلوۃ'' سے صلوۃ فرض ہوگئی تو ''ثم تتفکرو'' سے عقل کا استعمال کیوں فرض نہیں ہوا؟

یاد رکھیے کہ خدا نے انسان کو صاحبِ ارادہ و اختیار بنایا اور عقل دی تا کہ وہ اپنے فیصلے سوچ سمجھ کر، کر سکے اور ان فیصلوں کے لئے بجا طور پر ذمہ دار بھی ٹھہرایا جا سکے۔ قرآن کہتا ہے کہ

''خدا نے انسان کو دیکھنے سننے (یعنی سوچنے سمجھنے) کی صلاحیت دی اور اسے درست راستہ دکھا دیا۔ اب انسان کا جی چاہے تو اس راستے کو اختیار کر لے اور اس کا جی چاہے تو اس راستے سے انکار کر دے''
(2،3/الدھر)

حیوان کو صاحبِ ارادہ و اختیار نہیں بنایا گیا اور عقل نہیں دی گئی کہ جسے اپنے فیصلے خود کرنے کا اختیار ہی حاصل نہیں اسے عقل کی کیا ضرورت؟ قرآن کے بقول

''**یفعلون مایومرون**''انہیں جو کچھ حکم دیا جاتا ہے وہ اس کی تعمیل کرتے ہیں (50/النحل) ''**وھم لا یستکبرون**''اور انہیں اس بات کا اختیار ہی نہیں دیا گیا کہ وہ من مانی کریں اور احکام الٰہی سے سرکشی برتیں (49/النحل)۔

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق ہی عقل کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو انسان عقل سے کام نہیں لیتا اور سوچے سمجھے بغیر کسی کی بات مان لیتا ہے، اسے خدا حیوان سے بھی بدتر اور جہنمی قرار دیتا ہے (179/الاعراف، 44/الفرقان) اور کہتا ہے کہ

جب ان لوگوں کو جہنم میں ڈالا جائے گا تو یہ کہیں گے کہ اگر ہم عقل سے کام لیتے تو آج جہنم میں نہ ہوتے (10/الملک) خدا نے ان کے لیے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔ تو اے عقل و فکر سے کام لینے والو یعنی وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، تم ہمیشہ خدا کے قوانین کی نگہداشت

کرو۔اس مقصد کے لیے تمھاری طرف قرآن (تمھارا دستور بنا کر) نازل کیا گیا(10 / الطلاق)

قرآن نازل ہی اس لیے کیا گیا کہ لوگ عقل وفکر سے کام لے سکیں (29/ص، 3/الزخرف وغیرہ) قرآن میں حقائق کو بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے تا کہ لوگ عقل وفکر سے کام لیں اور ان حقائق کو سمجھیں (242/البقرۃ، 118/ال عمران، 151/الانعام، 2/یوسف، 67/النحل وغیرہ) قرآن نازل ہی اہلِ عقل وفکر کیلئے کیا گیا(3/حم السجدۃ، 52/ابراھیم) قرآن میں خدا مثالوں سے بات واضح کرتا ہے اور اسے اہلِ عقل وفکر ہی سمجھ سکتے ہیں (43/العنکبوت، 58,59/الروم) عقل وفکر سے کام لیا کرو(44/البقرۃ، 65/ال عمران، 32/الانعام، 169/الاعراف، 16/یونس، 51/ھود، 109/یوسف وغیرہ) قرآن پر غور وفکر کیا کرو(82/النساء) اپنے آپ پر غور وفکر کیا کرو(8/الروم) تخلیق انسانی پر غور وفکر کیا کرو (20,21/الروم، 67/المومن وغیرہ) مظاہرِ فطرت پر غور وفکر کیا کرو(164/البقرۃ، 190/ال عمران، 99/الانعام، 185/الاعراف، 5,6,67/یوسف، 3,4/الرعد وغیرہ)

قرآن کی رو سے غور وفکر کرنے والے لوگ ہی علماء بھی ہیں (43/العنکبوت، 22/الروم، 27,28/فاطر) غور وفکر کرنے والے لوگ ہی خدا کا ذکر کرنے والے بھی ہیں (191/ال عمران) اور غور وفکر کرنے والے لوگ ہی متقی بھی ہیں (5,6/یونس، 108/المائدہ وغیرہ)۔

چنانچہ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ

''آدمی نمازی، روزہ دار، زکوۃ دینے والا، حج اور عمرہ کرنے والا ہوتا ہے (یہاں تک کہ آپؐ نے سارے نیک کام گنائے) لیکن قیامت میں اسے اس کی عقل کے مطابق ہی جزا دی جائے گی'' (مشکوۃ۔ کتاب الاذان)

قرآن کی رو سے ایمان ہوتا ہی وہی ہے جو سوچ سمجھ کر لایا جائے۔ اسی لیے قرآن وراثت میں ملنے والے اسلام کو تسلیم نہیں کرتا اور پیدائشی مسلمانوں سے بھی یہ کہتے ہوئے ایمان کا تقاضا کرتا ہے کہ

''اے ایمان والو! ایمان لاؤ خدا پر اور اس کے رسولؐ پر اور قرآن پر اور اس سے پہلے نازل کی گئی سب کتابوں پر....'' (136/النساء)

اس آیت میں ظاہر ہے کہ خدا نے ''اے ایمان والو'' کہہ کر ان لوگوں کو مخاطب کیا ہے جو نام کے تو مسلمان ہیں لیکن کام کے مسلمان نہیں ورنہ ایمان والوں سے پھر ایمان کے مطالبے کا کیا مطلب؟ یعنی یہ لوگ اسلیے مسلمان ہیں کہ ان کے باپ دادا مسلمان تھے۔ اس طرح کے مسلمانوں اور ان غیر مسلموں میں کیا فرق ہے جو اس لیے مسلمان نہیں کہ ان کے باپ دادا کافر تھے؟ قرآن پیدائشی مسلمانوں اور پیدائشی غیر مسلموں کو ایک ہی آنکھ سے دیکھتا ہے اور اس حوالے سے کہتا ہے کہ

''وہ لوگ جو ایمان لائے یا جو یہودی ہیں یا جو عیسائی ہیں یا جو صابی ہیں ان میں سے جو کوئی بھی خدا اور آخرت پر ایمان لائے گا اور اچھے کام (یعنی قرآن کی اطاعت) کرے گا اس کا صلہ اس کے رب کے پاس ہو گا اور اس کے لیے نہ کوئی خوف ہو گا نہ کوئی حزن'' (62/البقرۃ)

اور یہ آیت ایک مرتبہ پھر پڑھیے کہ

اے عقل وفکر سے کام لینے والو یعنی وہ لوگوں جو ایمان لائے ہو
(10/الطلاق)

غور کیجئے کہ کتنے آسان اور غیر مبہم الفاظ میں اس بصیرت افروز حقیقت کا اعلان کر دیا گیا کہ اہلِ ایمان تو عقل استعمال کرنے والے لوگ ہی ہو سکتے ہیں۔ قرآن کی رو سے عقل اور ایمان ایک دوسرے کے لئے اسطرح لازم وملزوم ہیں جس طرح آنکھ اور اجالا۔ اجالا وہی دیکھ سکتا ہے جسکی آنکھ کھلی ہو اور ایمان وہی لا سکتا ہے جو عقل سے کام لیتا ہو۔

سب سے خطرناک عقیدہ جو مسلمانوں کی اکثریت میں عام کیا گیا وہ یہ ہے کہ قرآن پر غور وفکر کا سارا کام کیا جا چکا ہے جو روایات میں محفوظ ہے لہذا مسلمانوں کو قرآن کریم پر غور وفکر کرنے کے بجائے روایات کی پیروی کرنی چاہیے۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ اگر قرآن پر غور وفکر کا کام مکمل ہو چکا ہے تو پھر قرآن بات بات پر تمام نوعِ انسانی کو دعوتِ فکر کیوں دیتا ہے؟ اور وہ قرآن جس کا مقصد انسان کو مومن بنانا ہے اور جس کی رو سے مومن وہ ہوتا ہے جو (اور تو اور) اللہ کی بات بھی سوچے سمجھے بغیر نہیں مانتا، کیا اس قرآن کو دنیا تک پہنچانے والے نبیؐ کو یہ گوارہ ہو سکتا ہے کہ لوگ غور وفکر نہ کریں؟

اس سے بڑھ کر تاسف کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ جس نبیؐ کی دعوت وتبلیغ کی بنیاد ہی غور وفکر ہے اُس کے اکثر اُمتی عقل کو اُس کی تعلیمات کا سب سے بڑا حریف قرار دیتے ہیں۔ ہم لوگ کچھ اور نہیں کر سکتے تو کیا قرآن میں لکھی اس نصیحت پر بھی عمل نہیں کر سکتے جو بلاشبہ وبلاتبصرہ اسلام کا نچوڑ وخلاصہ ہے کہ

اے محمدؐ انہیں کہہ دو کہ میں تمہیں (کوئی لمبا چوڑا وعظ نہیں کرنا چاہتا بلکہ) صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں اور وہ ایک بات یہ ہے کہ تم عقل وفکر سے کام لیا کرو (46/سباء)

صبر

ظہیر کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بارش کی طرح برس رہے تھے اور چہرہ غصے سے دہک رہا تھا، سامنے بے گناہ باپ کی لاش پڑی تھی، اردگرد گاؤں کے سینکڑوں لوگ نظریں جھکائے کھڑے تھے۔ ظہیر سے آنکھ ملانے کا حوصلہ کسی میں بھی نہیں تھا کیونکہ ان کے سامنے جاگیردار کے غنڈوں نے ظہیر کے باپ کو بڑی بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا لیکن کسی نے بھی اسے بچانے کی کوشش نہیں کی۔

مقتول کا قصور یہ تھا کہ اس نے جاگیردار کی مرضی کے خلاف پہلے ظہیر کو میٹرک کا امتحان دلوایا اور اب اسے کالج میں داخلے کے لیے شہر بھیجنے کی باتیں کر رہا تھا۔ جاگیردار کہتا تھا کہ اگر گاؤں کے لوگ پڑھنے لکھنے اور شہر جانے لگ گئے تو اس کی زمینوں پر کام کون کرے گا؟

ظہیر کا بوڑھا باپ ایک ہمدرد انسان بھی تھا اور گاؤں میں کریانے کا واحد دکاندار بھی۔ گاؤں کے لوگ اس کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اس کے قتل سے ماحول پر ایسا گہرا سکوت طاری ہو گیا تھا کہ مولوی صاحب ظہیر کی طرف بڑھے تو ان کے قدموں کی چاپ بھی سنائی دینے لگی۔ انہوں نے ظہیر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولے کہ بیٹا صبر سے کام لو کیونکہ ''خدا صابرین کے ساتھ ہے''۔

یہ بات سن کر ظہیر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے چیخ کر مولوی صاحب سے پوچھا کہ اگر خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے تو پھر گاؤں کے لوگ بے یار و مددگار کیوں ہیں جبکہ انہوں نے کئی نسلوں سے وڈیروں کے ظلم سہنے اور صبر کرنے کے سوا کچھ کیا ہی

نہیں؟

اس سوال کا جواب وہ کہاں سے لاتے کہ صبر کا مروجہ مفہوم صبر کے قرآنی مفہوم کے الٹ ہے؟ ہمارے ہاں صبر نام ہے کچھ نہ کرنے کا جبکہ حقیقت میں صبر نام ہے کچھ کرتے رہنے کا۔

لغت کی رو سے

صبر کے معنی ہیں کسی شخص کا کسی مطلوبہ شے کے حصول کے لئے برابر مصروف کار رہنا (تاج العروس)۔اسی بنا پر وہ بادل جو چوبیں گھنٹے ایک ہی جگہ کھڑا رہے اور ادھر اُدھر نہ ہو 'الصَّبیُر' کہلاتا ہے۔اور پہاڑ کو بھی 'الصَّبیُر' کہتے ہیں (تاج العروس)۔ 'لا صُبِرۃُ' ان اونٹوں یا بکریوں کو کہتے ہیں جو صبح شام باقاعدہ اپنے مالکوں کے پاس واپس آ جائیں اور ان سے دور نہ رہیں (لین و تاج العروس)۔ 'اَلصَّابُورَۃُ' اس مٹی وغیرہ کو کہتے ہیں جو اس لئے کشتی میں رکھ دی جاتی ہے کہ اس سے کشتی جھکولے نہ کھائے (محیط المحیط) اور اس کا توازن قائم رہے۔ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر کے بنیادی معنوں میں استقامت، ثابت قدمی اور مسلسل جدوجہد داخل ہیں۔

اب آیئے قرآن کی طرف۔قرآن کہتا ہے کہ

'' خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے'' (66/ الانفال،153/ البقرۃ) کیونکہ ''صبر کرنے والے لوگ وہ ہیں جو خدا کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کی وجہ سے نہ ہمت ہارتے ہیں نہ بزدلی دکھاتے ہیں اور نہ ہی باطل کے آگے جھکتے ہیں'' (146/ال عمران)

چنانچہ ''جہاد میں صبر کرنے والے بیس مجاہد دوسو کافروں پر غالب رہیں گے''۔(65/الانفال)۔

ظاہر ہے کہ ان آیات میں صبر کرنے والے مجاہدین سے مراد ڈٹ کر مقابلہ کرنے والے مجاہدین ہے ۔ اسی اعتبار سے نظم و ضبط قائم رکھنے والوں کو بھی صابرین کہا گیا (5/الحجرات، 249/البقرۃ وغیرہ) اور حق پر قائم رہنے اور باطل سے دوستی نہ کرنے والوں کو بھی صابرین ہی کہا گیا (73,74/بنی اسرائیل)۔

اور یہ دعا دیکھئے کہ

''اے ہمارے رب ہم پر صبر کے دہانے کھول اور ہمیں ثابت قدم رکھ (ثبت **اقدامنا**) اور کفار پر فتح دے''(250/البقرۃ نیز دیکھئے 7/محمد، 146/ال عمران)۔

ان آیات سے بھی یہی بات سامنے آتی ہے کہ قرآن کی رو سے صبر کرنے کا مطلب ثابت قدمی سے مسلسل جدوجہد کرنا ہے۔اور حضور پاکؐ کا یہ فرمان مبارک دیکھئے کے جس سے صبر کا قرآنی مفہوم بالکل ہی واضح ہو جاتا ہے کہ

''اے لوگو دشمن سے لڑائی کی تمنا نہیں کرو۔اس بات کی دعا کرو کہ اللہ اپنی عافیت میں رکھے۔لیکن جب دشمن سے بھڑ جاؤ تو صبر سے کام لو اور اس بات کا یقین رکھو کہ جنت تلواروں کے سائے میں ہے''

(متفق علیہ)

جہاں تک ظہیر اور اس کے گاؤں والوں کا تعلق ہے تو خدا نے صاف الفاظ میں کہہ رکھا ہے کہ

....اگر کوئی تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس کے ساتھ ویسی ہی زیادتی

کرو جیسی اس نے تمھارے ساتھ کی اور خدا کا تقوی اختیار کرو(194/البقرۃ)

....ایمان لانے والے اور نیک کام کرنے والے اور خدا کو بہت یاد کرنے والے لوگ وہ ہیں جو اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا انتقام لیتے ہیں(227/الشعراء)۔

....وہ (مومنین) ظلم کا بدلہ لیتے ہیں اور یہ قانون خداوندی کے تحت جرم نہیں (کہ اس سے ظلم کی روک تھام ہوتی ہے)۔ جرم تو یہ ہے کہ دوسروں پر ظلم کیا جائے (اور طاقت کے نشے میں بدمست ہو کر) نا حق ملک میں ادھم مچایا جائے۔ ایسا کرنے والے لوگ الم ناک سزا کے مستحق ہیں(41,42/الشوری)

....جن لوگوں پر ظلم ہوا انہیں ظالموں کے ساتھ جنگ کرنے کی اجازت ہے اور اس جنگ میں خدا یقیناً انکے ساتھ ہے(39/الحج)۔ چنانچہ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ

....اگر قوم کا کوئی آدمی انکے درمیان گناہ (ظلم) کرتا ہو اور وہ (قوم کے لوگ) اسے روکنے کے استطاعت رکھتے ہوں لیکن نہ روکیں تو اللہ سب (قوم) پر عذاب بھیجے گا (ابوداؤد، ابن ماجہ، مشکوۃ)

....اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ ایک شخص عرض گزار ہوا کہ یا رسول اللہؐ مظلوم کی مدد تو کروں لیکن ظالم کی مدد کیسے کروں؟ فرمایا اسے ظلم سے روک دو یہی تمہارا اسکی مدد کرنا ہے (متفق علیہ)

....جب لوگ کوئی برا کام دیکھیں اور اسے نہ روکیں تو قریب ہے کہ اللہ ان پر عذاب بھیج دے (ابن ماجہ، ترمذی، مشکوۃ)۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن وسنت کی رو سے جا گیردار کو کیفرِ کردار تک پہنچانا خدا کا تقوی اختیار کرنا ہے کیونکہ خدا ظالموں کو اسقدر ''ناپسند کرتا ہے'' (57,140/ال عمران، 40/الشوریٰ) کہ وہ ظالموں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتا (27/المومنون) اور ظالموں کے ساتھ مفاہمت کو بھی ناجائز قرار دیتا ہے (113/ھود)۔ ظلم سہتے رہنا اور اس کے خلاف بغاوت نہ کرنا درحقیقت خدا کی آیتوں سے منہ پھیرنا ہے اور خدا کہتا ہے

اس سے بڑھ کر ظلم اور کیا ہوگا کہ کوئی خدا کی آیتیں سننے کے بعد ان سے منہ پھیر لے (57/الکھف، 22/السجدۃ) (یعنی قرآن کی رو سے ظلم کا حساب نہ لینا بھی ظلم ہے)۔

یہاں آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ قرآن میں مجرم کو معاف کرنے کی گنجائش بھی تو رکھی گئی ہے کہ اس سے اصلاح احوال کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ اس کا جواب آپ کو ان آیات سے کسی تبصرے کے بغیر مل جائے گا کہ

....ہم نے انہیں حکم دے رکھا تھا کہ جس شخص نے کسی کو (ناحق) قتل کر دیا اس کی سزا موت ہوگی۔ جان کا بدلہ جان، آنکھ کا بدلہ آنکھ، کان کا بدلہ کان، دانت کا بدلہ دانت۔ یعنی صرف قتل کا جرم ہی مستوجبِ سزا نہیں (بلکہ) کسی کو زخمی کر دینا بھی ایسا جرم ہے جس کی سزا دی جائے۔ اور جیسا جرم ہوگا ویسی ہی سزا بھی ہوگی لیکن اگر مستغیث، مجرم کو (کسی زور زبردستی کے بغیر) خود معاف کر دے تو یہ چیز مجرم کا

کفارہ ہو جائے گی (45/المائدہ)

....یہ لوگ (مومنین) اس طرح ایک برادری کے افراد بن کر زندگی بسر کرتے ہیں کہ جب ان پر کسی طرف سے ظلم ہوتا ہے تو یہ مل کر اپنے بچاؤ کا انتظام کرتے ہیں اور ظلم کرنے والے سے بدلہ لیتے ہیں لیکن بدلہ لینے میں اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہیں کہ سزا جرم کے مطابق ہو (نہ جرم سے کم ہو نہ جرم سے زیادہ) لیکن اگر وہ دیکھتے ہیں کہ ظلم کرنے والا اپنے کیے پر نادم ہے اور اسے معاف کر دیا جائے تو اس کی اصلاح ہو سکتی ہے تو وہ اس سے درگزر کرتے ہیں (39,40/ الشوریٰ)۔

بات یہ کہ قرآن مجرم کو سزا ضرر پہنچانے کے لئے تجویز نہیں کرتا بلکہ راہ راست پر لانے کے لئے تجویز کرتا ہے لہذا اگر مجرم سزا کے بغیر ہی راہ راست پر آ سکے تو اسے معاف کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔

بہر طور یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ جسم کا کوئی حصہ سرطان میں مبتلا ہو جائے تو اس کا علاج کروانے کی پوری کوشش کی جاتی ہے لیکن وہ لاعلاج ہو جائے تو اسے کاٹ کر جسم سے الگ کرنا پڑتا ہے بصورتِ دیگر سرطان سارے جسم میں پھیل جائے گا اور موت یقینی ہوگی۔ بالکل اسی طرح ظلم کو نیست و نابود نہ کیا جائے تو اس سے سارے کا سارا معاشرہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اسی لئے تو قرآن غلطی سے ہونے والے قتل کی سزا بھی تجویز کرتا ہے تاکہ لوگ معاشرتی زندگی میں لاپرواہی سے کام نہ لیں۔

بات ہو رہی تھی ظہیر اور اس کے گاؤں والوں کی۔ آپ جان ہی چکے ہوں گے وڈیرے کو کیفر کردار تک پہنچانا دراصل خدا کا تقویٰ اختیار کرنا ہے اور گاؤں والوں پر قرآن و

سنت کی رو سے یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ وڈیرے کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیں اور پھر اس جہاد میں صبر سے کام لیں یعنی نہ ہمت ہاریں نہ بزدلی دکھائیں اور نہ ہی وڈیرے کے آگے جھکیں۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو بیس گاؤں والے وڈیرے کے دوسو غنڈوں پر غالب رہیں گے (بشرطیکہ وڈیرے کا ایک غنڈا اسلحے اور جسمانی قوت کے اعتبار سے گاؤں کے ایک فرد کے برابر ہو)۔

خدا صابرین کے ساتھ ہے کیونکہ صابرین ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے نہیں رہتے بلکہ ثابت قدمی کے ساتھ اپنے مقصد کے حصول کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔

قل العفو

کہنے کو تو انسان اشرف المخلوقات ہے لیکن خود غرضی اور بے راہ روی میں اس نے درندوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ وہ اس طرح کہ درندے بھی اس وقت تک خوراک کیلئے نہیں لڑتے جب تک انکے پیٹ خالی نہ ہوں لیکن انسان اس وقت بھی خوراک کے لیے لڑتا ہے جب اس کا پیٹ بھرا ہوا ہو۔ بات یہ ہے کہ درندوں کو پیٹ بھر کر کھانا مل جائے تو وہ اس وقت تک کھانے کی فکر سے مکمل طور پر آزاد ہو جاتے ہیں جب تک انکے پیٹ دوبارہ خالی نہیں ہوتے لیکن انسان کسی حال میں بھی کھانے کی فکر سے آزاد نہیں ہوتا۔ ایک وقت کا کھانا مل جائے تو اسے کھانے سے پہلے ہی دوسرے وقت کے کھانے کیلئے پریشان ہو جاتا ہے۔ اور اس پریشانی سے اسے اس وقت بھی رہائی نہیں ملتی جب وہ اپنی ساری زندگی کیلئے کھانے کا بندوبست کر لیتا ہے کیونکہ اس کے بعد اسے اپنے بچوں اور پھر انکے بچوں کے کھانے کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔

قرآن گواہ ہے کہ

جب انسان وحی کی رہنمائی کو چھوڑ کر حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتا ہے تو وہ کس قدر تنگ دل، بھوکا اور بے صبرا ہو جاتا ہے (19/المعارج)

نظامِ خداوندی کی طرف سے منہ پھیر کر بھاگتا اور گریز کی راہیں نکالتا ہے، مال و دولت کو فلاحِ عامہ میں کھلا نہیں رکھتا بلکہ تھیلی میں جمع کرتا رہتا ہے اور اس کا منہ اوپر سے کس کر باندھ دیتا ہے۔ تجوریاں بھرتا

ہے(18-17/المعارج) مال جمع کرتا ہے اور اسے گن گن کر رکھتا ہے(2/الھمزۃ) چاہتا ہے کہ اس کا اپنا مال بھی اسی کے پاس رہے اور دوسروں کا مال بھی انکی موت کے بعد اسی کو مل جائے (19/الفجر) سمجھتا ہے کہ یہی مال اسے ہمیشہ کی زندگی عطا کرے گا (3/الھمزۃ) مفادِ عاجلہ کو عزیز رکھتا ہے اور ہمیشہ کے مفاد کو نظر انداز کر دیتا ہے (20,21/القیمۃ) دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے (16,17/ الاعلی)۔

قرآن کی رو سے

(جو لوگ نظامِ خداوندی کو جھٹلاتے ہیں ان کی نگاہیں صرف طبیعی زندگی کے بے وقعت مفاد پر ہوتی ہیں حالانکہ قرآن کے دیے ہوئے بلند تصور کے سامنے) طبیعی مفاد کی حیثیت محض کھیل تماشے کی سی ہوتی ہے جس سے کچھ وقت کے لیے دل بہلا لیا جائے۔ یا زیبائش و آرائش کر لی جائے۔ یا اس پر فخر کیا جائے کہ میرے پاس دوسروں کے مقابلے میں بہت زیادہ ساز و سامان ہے۔ یا مال و دولت اور اولاد میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی دوڑ لگائی جائے (یہ چیزیں بھی ضروری ہیں بشرطیکہ انہیں زندگی کے بلند مقاصد کے حصول کا ذریعہ سمجھا جائے لیکن انہیں مقصود بالذات سمجھ لیا جائے تو یہ تصور باطل ہے) اس سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے اس کی مثال ایسی کھیتی کی سی ہے جو بارش کے ایک چھینٹے سے اُگ کھڑی ہو اور اسے دیکھ کر کسان بہت خوش ہو جائے لیکن ایسی کھیتی دوسرے ہی دن خشک

ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ ذرا سی دھوپ سے زرد پڑ جاتی ہے اور پھر چور چور ہو کر مرجھا جاتی ہے۔ محض طبیعی زندگی کو مقصودِ حیات سمجھ لینے سے سامانِ زیست تو ضرور مل جاتا ہے لیکن وہ متاع بڑی ناپائیدار اور کم قیمت ہوتی ہے اور اس سے انسان دھوکہ کھا جاتا ہے (20/ الحدید)

اس غفلت کی وجہ قرآن کے مطابق ''تکاثر'' یعنی مال و دولت اور جاہ و منصب میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی ہوس ہے جس کے ماتحت کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ جتنا حاصل کرتے جاؤ اتنی ہی ہوس بڑھتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ انسان قبر کے گڑھے تک جا پہنچتا ہے (2-1/التکاثر نیز دیکھئے 8-6/العدیت)

قرآن کہتا ہے کہ

جس معاشرے میں تکاثر کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے، وہاں (یتیموں یعنی) ان لوگوں کو جو تنہا رہ جائیں عزت و توقیر نہیں ملتی (وہی قابلِ عزت سمجھا جاتا ہے جس کی پارٹی مضبوط ہو)۔ اس معاشرے میں (مسکینوں یعنی) ان لوگوں جو کسی حادثے کا شکار ہو کر اپنا سامانِ زیست خود نہیں کما سکتے، کو بھی ضروریاتِ زندگی سے محروم رکھا جاتا ہے۔ صاحبِ استعداد لوگ نہ خود ان کی مدد کرتے یں نہ دوسروں کو اس کی ترغیب دیتے ہیں (17,18/الفجر) ایسا باطل نظام زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا اور یہی وہ نظام ہے جسے قائم رکھنے والوں پر روزی تنگ ہو جاتی ہے اور اپنی کرتوتوں کی وجہ سے ذلیل و خوار ہو کر رہ جاتے ہیں (16/الفجر)

اس تباہ کن روش کا نتیجہ جہنم ہے (4/الھمز ،6/التکاثر) اور اس وقت تم سے پوچھا جائے گا کہ خدا کی ان نعمتوں کو جنہیں اس نے تمام نوعِ انسان کی پرورش کے لیے عطا کیا تھا، تم فقط اپنی ہوس کی تسکین کے لئے کیوں سمیٹے چلے جاتے تھے؟ تم سے پوچھا جائے گا کہ تمھارے قصرِ تعیش کی رنگینیوں میں کس کس کے خون کی سرخی شامل تھی؟ جو کچھ تم نے سمیٹا وہ کس کی محنت کا ماحصل تھا اور تمھیں اسے غصب کر لینے کا کیا حق حاصل تھا؟ (8/التکاثر)

آپ نے دیکھا کہ جب انسان احکام الٰہی سے غافل ہو جاتا ہے اور قرآنی ہدایات پر عمل نہیں کرتا تو وہ معاشرے کے اجتماعی مفاد کو اپنے ذاتی مفاد پر قربان کر دیتا ہے۔ اور اس طرح وہ انسانی سطح سے گر کر حیوانی سطح پر آ جاتا ہے۔ آپ خود ہی فرمایئے کہ اکثر انسان اسکے سوا اور کیا کرتے ہیں کہ وہ پیدا ہوتے ہیں، پروان چڑھتے ہیں، جاگتے ہیں، سوتے ہیں، لیٹتے ہیں، بیٹھتے ہیں، اٹھتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں، رزق ڈھونڈتے ہیں، بچے پیدا کرتے ہیں، بچوں کی پرورش کرتے ہیں، اپنے بچوں کیلئے دوسروں کے بچوں کا حق مارتے ہیں وغیرہ وغیرہ اور آخر میں مر جاتے ہیں۔ آپ خود ہی سوچیے کہ ان سب کاموں میں سے ایسا کونسا کام ہے جو حیوان نہیں کرتے؟

یہ بات ہمیشہ یاد رکھیے کہ انسان اور حیوان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ خدا نے حیوان کے برعکس انسان میں اپنی روح پھونک کر (9/السجدۃ) اسے اسکے ''جسم'' کے علاوہ ایک ''ذات'' بھی عطا کی جسے قرآن انسانی نفس کہہ کر پکارتا ہے (اسی کو انسان کی خودی یا انا بھی کہا جاتا ہے)۔ اور یہ بات بھی کبھی نہ بھولیے کہ جسم اور ذات ایک دوسرے کی ضد ہیں کہ .... جسم کا تعلق دنیا سے ہے اور ذات کا آخرت سے

.... جسم فانی ہے اور ذات غیر فانی

.... جسم قابلِ تقسیم ہے اور ذات نا قابلِ تقسیم

یہی وجہ ہے کہ جو چیز جسم میں تعمیر و ترقی پیدا کرتی ہے اسی سے ذات تخریب و تنزلی کا شکار ہوتی ہے۔ ''جسم'' کی پرورش کچھ ''لینے'' سے ہوتی ہے تو ''ذات'' کی پرورش کچھ ''دینے'' سے۔ مثال کے طور پر آپ کو بھوک لگی ہے اور آپ کے پاس ایک ہی روٹی ہے۔ اب اگر آپ یہ روٹی خود کھالیں گے تو اس سے آپ کا جسم پروان چڑھے گا اور اگر یہی روٹی (خود کھانے کے بجائے) کسی دوسرے بھوکے شخص کو کھلا دیں گے تو اس سے آپ کی ذات پروان چڑھے گی۔

یہاں یہ بات بھی مختصراً جان لیجئے کہ جسم و ذات کی تفریق نے نوع انسانی کو شروع دن سے ہی دو گروہوں میں تقسیم کیا ہوا ہے۔ ایک گروہ ''مادیئین'' پر مشتمل ہے جنہیں ''مادہ پرست'' کا نام دیا جاتا ہے اور دوسرے گروہ میں ''روحانین'' شامل ہیں جنہیں ''خدا پرست'' سمجھا جاتا ہے۔

''مادیئین'' کا نظریہ یہ ہے کہ

.... انسانی جسم ہی اصل شے ہے روح کی کوئی حقیقت و اہمیت نہیں

.... دنیا ہی سب کچھ ہے آخرت کچھ بھی نہیں

.... انسان کا فائدہ کھانے میں ہے کھلانے میں نہیں

.... لہذا انسان کو ''لینا'' تو سب کچھ چاہیے لیکن ''دینا'' کچھ بھی نہیں چاہیے

اور روحانین کا عقیدہ یہ ہے کہ

.... انسانی ذات ہی اصل شے ہے انسانی جسم کی کوئی حقیقت و اہمیت

نہیں

.... آخرت ہی سب کچھ ہے دنیا کچھ بھی نہیں

.... انسان کا فائدہ کھلانے میں ہے کھانے میں نہیں

.... لہٰذا انسان کو ''دینا'' تو سب کچھ چاہیے لیکن ''لینا'' کچھ بھی نہیں چاہیے

مادئیین کا نظریہ ہو یا روحانین کا عقیدہ۔ دونوں ہی قرآنی تعلیمات کے خلاف ہیں کہ قرآن نہ تو یہ گوارا کرتا ہے کہ دنیا درندوں کا بھٹ بن جائے اور نہ ہی یہ دیکھ سکتا ہے کہ بستیاں بیابانوں میں تبدیل ہو جائیں۔

اول الزکر کے بارے میں قرآن یہ کہتا ہے کہ

''یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ اسی میں ہم پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں اور ہماری موت زمانے کی گردش سے واقع ہوتی ہے۔ ان کا یہ خیال علم پر مبنی نہیں۔ محض ظن و قیاس کا اتباع ہے'' (24/الجاثیۃ نیز دیکھیے 29/الانعام)

اور ثانی الزکر کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ

''یہ مسلک رہبانیت ان لوگوں کا خود تراشیدہ ہے۔ ہم نے انہیں اس مسلک کا حکم نہیں دیا تھا۔ (انکے پاس اس مسلک کی کوئی خدائی سند نہیں بلکہ) انہوں نے اپنے طور پر ہی اسے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھ لیا تھا'' (27/الحدید)۔

قرآن چاہتا ہے کہ انسان اپنے جسم اور ذات دونوں کی پرورش کرے یعنی دنیا اور آخرت دونوں کو بیک وقت نگاہ میں رکھے (45/یس) کیونکہ قرآن کی رو سے دنیا اور

آخرت ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم ہیں۔اسی لیے تو قرآن کے بقول دنیا کا اندھا آخرت کا بھی اندھا ہوتا ہے(72/بنی اسرائیل)

اب تک کی بات سے یہ تو طے ہو گیا کہ انسان نام ہے جسم اور ذات کے مجموعے کا اور پرورش دونوں کی ضروری ہے۔لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دونوں کی پرورش بیک وقت کس طرح کی جائے۔ کیونکہ جسم کی پرورش ''لینے'' سے ہوتی ہے اور ذات کی پرورش ''دینے'' سے۔یعنی جسم کو پروان چڑھایا جائے تو ذات پروان نہیں چڑھ سکتی اور ذات کو پروان چڑھایا جائے تو جسم پروان نہیں چڑھ سکتا۔ یہ ہے وہ راز ''جو فلسفیوں سے کُھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا''۔لیکن قرآن نے اس انتہائی گھمبیر مسئلے کو ''قل العفو'' کے دو لفظوں میں یکسو کر کے انسان کو اپنے دونوں جہاں سنوارنے کا ایک نہایت ہی عمدہ راستہ دکھا دیا کہ

> اے محمدؐ یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کتنا مال اللہ کی راہ میں (یعنی معاشرے کی فلاح و بہبود کیلئے) خرچ کریں۔ (قل العفو) ان سے کہہ دو کہ ان کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ جتنا (مال) بھی ہے (سب خرچ کر دیں) اسطرح خدا اپنے احکام تمھارے لیے کھول کھول کر (وضاحت سے) بیان کرتا ہے تا کہ تم غور وفکر کرو اور سوچو کہ تمھیں کس طرح دنیا اور آخرت دونوں کی خوشگواریاں مل سکتی ہیں(219,220/البقرۃ)

یعنی انسان کو اپنے مال کا اتنا حصہ خود ''لے'' لینا چاہیے جتنا اسے جائز طور پر ضرورت ہو تا کہ اسکے جسم میں تعمیر وترقی پیدا ہو اور اسکی دنیا اچھی ہو جائے۔اور اپنے مال کا باقی حصہ فلاحِ عامہ میں ''دے'' دینا چاہیے تا کہ اسکی ذات میں تعمیر وترقی پیدا ہو اور اسکی

آخرت بھی اچھی ہو جائے۔ آسان لفظوں میں یوں کہیے اگر آپ کے پاس ایک روٹی ہے لیکن آپ کے علاوہ کوئی اور شخص بھی بھوکا ہے تو نہ یہ بات ٹھیک ہے کہ آپ ساری روٹی خود کھالیں اور نہ ہی یہ ٹھیک ہے کہ آپ ساری روٹی اسے کھلا دیں۔ آپ کو کرنا یہ چاہیے کہ آدھی روٹی خود کھالیں اور آدھی روٹی اسے کھلا دیں۔ تاکہ آپ کے جسم اور ذات دونوں میں تعمیر و ترقی پیدا ہو اور آپ کو دنیا اور آخرت دونوں کی خوشگواریاں نصیب ہوں۔ یہ بات یوں بھی سمجھی جا سکتی ہے کہ اگر آپ استاد ہیں تو کچھ بچوں کو ٹیوشن لے کر پڑھا لیا کریں اور کچھ غریب بچوں کو مفت، اور اگر ڈاکٹر ہیں تو کچھ مریضوں کو فیس کے عوض دیکھ لیا کریں اور کچھ (جو فیس نہیں دے سکتے ان) کا طبی معائنہ مفت کر لیا کریں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کوئی بھی کام کریں اس کا کچھ حصہ اپنے اور کچھ دوسروں کے لیے وقف کر دیا کریں تاکہ آپ کی دنیا بھی اچھی ہو جائے اور آخرت بھی۔

حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ

وہ مومن نہیں جو پیٹ بھرے اور اس کا ہمسایہ بھوکا ہو (مشکوۃ)

اس حدیثِ مبارکہ کو قرآنی تعلیمات کی روشنی میں یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ کسی شخص کا یہ رویہ کہ وہ اپنے کھانے کا بندوبست کرے (یعنی اپنی فلاح و بہبود کا خیال رکھے) لیکن دوسرے کے کھانے کا بندوبست نہ کرے (یعنی دوسروں کی فلاح و بہبود کا خیال نہ رکھے)، اس حقیقت کا امین ہے کہ اسے اچھی دنیا کی فکر تو ہے لیکن اچھی آخرت کی فکر نہیں جبکہ قرآن کی رو سے

.... مومنین دنیا اور آخرت دونوں کی خوشگواریاں حاصل کرنے کے بارے میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں (219,220/البقرۃ)

.... مومنین کی کوشش (یعنی دعا) یہ ہوتی ہے کہ انہیں دنیا اور آخرت

دونوں میں خوشگواریاں ملیں (201/البقرۃ، 156/الاعراف)

حقیقت تو یہ ہے کہ جو شخص اپنی ضروریات (یعنی دنیا) کا خیال رکھے لیکن دوسروں کی ضروریات (یعنی آخرت) کا خیال نہ رکھے وہ خود کو کتنا ہی عقلمند کیوں نہ سمجھے لیکن وہ ایک بیوقوف شخص ہوتا ہے۔ چناچہ حضورؐ نے فرمایا کہ

....مال وہی جمع کرتا ہے جس کی عقل نہیں ہوتی (مشکوۃ۔ احمد۔ بیہقی)

.... تم لوگ زمین و جائیداد مت بناؤ ورنہ تمہارے اندر دنیا کی حرص آ جائے گی (مسند احمد)

....مال بڑھانے والے فخر کرنے والے اور دولت مندی دکھانے والے سے خدا ناراض ہوگا (مشکوۃ۔ بیہقی۔ شعب الایمان)

.... دینار و درہم کے بندوں پر لعنت ہے (ترمذی)

....اہلِ صفا میں ایک آدمی کا انتقال ہو گیا اور اس نے ایک دینار چھوڑا۔ حضورؐ نے فرمایا (کہ یہ دینار) ایک داغ ہے (مشکوۃ۔ احمد۔ بیہقی)

.... خرچ کر اور گن گن کر نہ رکھ ورنہ اللہ تجھے بھی گن گن کر دے گا (مسلم)

....انسان کی ضرورت اس سے زیادہ کچھ نہیں یعنی رہنے کے لیے گھر ستر چھپانے کے لیے کپڑا اور پیٹ بھرنے کے لیے روٹی اور پانی (ترمذی)

....ایک اور موقع پر آپؐ نے 'الھاکم التکاثر' پڑھتے ہوئے فرمایا

کہ ۔انسان کہتا ہے کہ یہ میرا مال ہے یہ میرا مال ہے لیکن تیرا مال وہی
ہے جو تو نے صدقہ کر کے جاری رکھا یا کھا کر فنا کر دیا یا پہن کر پرانا
کر دیا (ترمذی)

کاش مسلمان قرآن کی گہرائی میں اتر کر اس معاشی نظام کا سراغ پا سکیں جس کی عمارت حضورؐ کے ہاتھوں ''قل العفو'' کی بنیاد پر اٹھی تھی کہ یہی وہ معاشی نظام ہے جس کی موجودگی سے دنیا جنت اور غیر موجودگی سے جہنم بن جاتی ہے۔علامہ اقبال کے بقول

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار
جو حرفِ ''قل العفو'' میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

دعا

نتیجہ نکل گیا۔ منظر فیل ہو گیا اور اظفر نے پورے سکول میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ سب جانتے تھے کہ یہی ہو گا۔ دونوں کی تیاری ہی اسی تھی۔ منظر کو ایک لفظ بھی نہیں آتا تھا جبکہ اظفر کو ایک ایک لفظ آتا تھا کیونکہ امتحان کی تیاری میں منظر نے صرف حاجت نمازیں اور اظفر نے صرف کتابیں پڑھی تھیں۔

منظر نے جمعہ کے وعظ میں مولوی صاحب سے یہ سن لیا تھا کہ دل سے کی ہوئی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ مولوی صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ خدا پر توکل کرنے والوں کو کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لہذا کتابوں کے آگے بیٹھنے کے بجائے منظر توکل پر بیٹھ گیا۔ پورے خلوص سے پڑھائی کرنے کے بجائے خدا سے امتحان میں کامیابی کی دعائیں مانگتا رہا اور وقت ہاتھ سے نکل گیا۔ اب وہ رزلٹ کارڈ کی صورت میں اپنے توکل اور دعاؤں کا نتیجہ ہاتھ میں لئے مولوی صاحب کے سامنے بیٹھا تھا اور مولوی صاحب اس سے کہہ رہے تھے کہ ''بیٹا امتحان میں کامیابی کے لئے دعا بھی ضروری ہوتی ہے اور پڑھائی بھی۔ نہ دعا کے بغیر پڑھائی کا کچھ فائدہ ہے نہ پڑھائی کے بغیر دعا کا''۔

وہ بولا کہ ''لیکن مولوی صاحب! اظفر نے کبھی دعا نہیں کی۔ وہ تو خود بھی پڑھتا تھا اور مجھے بھی صرف پڑھنے کی تلقین کرتا تھا''۔ اور مولوی صاحب نے یہ کہہ کر اس سے جان چھڑائی کہ ''وہ تم سے چھپ کر دعائیں مانگتا ہو گا''۔

کاش مولوی صاحب منظر سے جان چھڑانے کے بجائے اس کے سوال پر غورِ فکر

کرتے (جس کی تلقین قرآن بار بار کرتا ہے) تو کم از کم اتنا ضرور سوچتے کہ جس جمعے کے وعظ میں انہوں نے یہ کہا تھا کہ خلوصِ دل سے مانگی ہوئی ہر دعا ضرور قبول ہوتی ہے اسی سے پچھلے جمعے کے وعظ میں انہوں نے یہ فرمایا تھا کہ انسان چاہے کچھ بھی کر لے لیکن ہوتا وہی ہے جو خدا کو منظور ہوتا ہے۔ کیا یہ دونوں متضاد باتیں بیک وقت درست ہوسکتی ہیں؟

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر خلوصِ دل سے مانگی ہوئی ہر دعا ضرور قبول ہوتی ہے تو قسمت کا لکھا اٹل کیسے ہوسکتا ہے؟ کیا کوئی قسمت کے لکھے کے خلاف دعا نہیں مانگ سکتا؟ اور یہ معلوم کسے ہے کہ اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے؟

اور اگر قسمت کا لکھا اٹل ہوتا ہے تو خلوصِ دل سے مانگی ہوئی ہر دعا کیسے قبول ہو سکتی ہے؟ اگر کوئی خلوصِ دل سے یہ دعا مانگ لے کہ اس کا جگر جو کینسر کے باعث مکمل طور پر فیل ہو چکا ہے فوراً ٹھیک ہو جائے تو کیا اس کی دعا قبول ہو جائے گی؟ یا اگر کوئی دل کی تمام تر گہرائی سے یہ دعا کرے کہ ملتان کے گرم علاقے میں سیب پیدا ہونے لگے جو سرد علاقے کا پھل ہے تو کیا یہ دعا پوری ہوسکتی ہے؟

مولوی صاحب نے کبھی اس بات پر بھی توجہ نہیں دی کہ اگر دل کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے تو وہ زمین کا مقدمہ کیوں ہار گئے؟ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مولوی صاحب کے فریق کی دعاؤں میں زیادہ خلوص تھا تو اس کا مطلب کیا یہ نہیں نکلتا کہ پُرخلوص دعاؤں کے زور پر خدا کو غلط فیصلہ کرنے پر بھی مجبور کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس مقدمہ میں مولوی صاحب کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی اور حق پر تھے؟

اور اگر یہ مان لیا جائے (جیسا کہ مولوی صاحب کا اپنا خیال بھی ہے) کہ خدا نے مولوی صاحب کی دعا کے خلاف فیصلہ اس لئے کیا کہ ان کے حق میں یہی بہتر تھا۔ تو بات یہ ہے کہ اگر خدا نے وہی فیصلہ کرنا ہوتا تو جو انسان کے حق میں بہتر ہے تو پھر اس بات سے فرق

ہی کیا پڑتا ہے کہ انسان دعا کرے یا نہیں کرے؟

دعا کے درست مفہوم پر گفتگو سے پہلے سے بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ خدا نے کائنات کو تخلیق کیا اور پھر انسان کی سہولت کے لئے اسے ایک ''غیر متبدل'' قانون (If - Then - Always) کا پابند بنا دیا ہے، اسی قانون کو قرآن کلمتہ اللہ اور سنت اللہ کہہ کر پکارتا ہے (34,115/ الانعام، 64/ یونس، 27/ الکھف وغیرہ وغیرہ) کہ ''اگر'' یہ ہوا ''تو'' یہ ہوگا اور ''ہمیشہ'' یہی ہوگا۔

''اگر'' آگ میں ہاتھ ڈالو گے ''تو'' ہاتھ جل جائے گا۔ ''اگر'' جلے ہوئے ہاتھ پر مرہم نہیں لگاؤ گے ''تو'' ہاتھ گل سڑ جائے گا۔ ''اگر'' جلے ہوئے ہاتھ پر مرہم لگاؤ گے ''تو'' ہاتھ ٹھیک ہو جائے گا، اور ''ہمیشہ'' ایسا ہی ہوگا وغیرہ وغیرہ (اسی کو قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں جس کی رو سے انسان کا ہر عمل از خود ایک خاص نتیجہ مرتب کرتا ہے)۔

بالکل ویسے ہی جیسے گاڑیاں بنانے والی کوئی کمپنی گاڑی بنا کر گاہکوں کی سہولت کے لیے اسے ایک غیر متبدل قانون کا پابند بنا دیتی ہے کہ ''اگر'' ایکسیلیریٹر دباؤ گے ''تو'' گاڑی تیز ہوگی۔ ''اگر'' بریک لگاؤ گے ''تو'' گاڑی رک جائے گی، اور ''ہمیشہ'' ایسا ہی گا (بشرطیکہ گاڑی کے نظام میں کوئی خرابی نہ ہو کہ انسان کا بنایا ہوا نظام خراب بھی ہو سکتا ہے لیکن خدا کا بنایا ہوا نظام تو کبھی خراب نہیں ہوتا)۔

آپ خود سوچیے کہ کیا آگ میں ہاتھ ڈالنے والے شخص کے ہاتھ کو اس کی اپنی یا کسی دوسرے کی دعا جلنے سے بچا سکتی ہے؟ اور کیا یہ حماقت نہیں کہ کوئی شخص جلے ہوئے ہاتھ پر مرہم لگانے کے بجائے خدا سے ہاتھ ٹھیک ہونے کی دعا کرے؟ یہ تو ایسے ہی ہوا کہ کوئی شخص بریک لگانے کے بجائے گاڑیاں بنانے والی کمپنی سے گاڑی رکنے کی دعا کرے؟

اب آیئے قرآن کریم کی طرف، خدا کہتا ہے کہ

جب کوئی دعا کرنے والا مجھ سے دعا کرتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں (186/البقرۃ)

غور کیجئے کہ کیا اس آیت کو دعا کے مروجہ مفہوم (خدا سے ہاتھ اٹھا کر صدق دل سے کچھ مانگنا) کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ (نعوذ باللہ) قرآن کو غلط ثابت کرنے کے مترادف نہیں ہوگا؟ کیا خدا ہر کسی کے دل کی ہر خواہش پوری کر دیتا ہے؟ کیا دنیا کی کوئی ایک ماں بھی ایسی ہوگی جو اپنے بچوں کے لیے دل کی تمام تر گہرائی سے یہ دعا نہیں مانگتی کہ وہ کامیاب ہو جائیں؟ تو کیا سب بچے کامیاب ہو جاتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔

اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ دو مسلمان بیک وقت ایک ہی معاملے میں خلوصِ دل سے دو الگ الگ دعائیں مانگ رہے ہوں، مثال کے طور پر پاکستان اور بنگلہ دیش کی ٹیموں کے درمیان کرکٹ کا میچ ہو رہا ہو اور بنگلہ دیش کے مسلمان صدقِ دل سے اپنی ٹیم کی کامیابی اور پاکستان کے مسلمان خلوصِ نیت سے اپنی ٹیم کی کامیابی کی دعا کر رہے ہوں؟ تو کیا خدا بیک وقت دونوں کی دعا پوری کر سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ بھی ممکن نہیں۔

دعا کے مروجہ مفہوم کو خدا خود ہی یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ

اگر خدا لوگوں کی خواہشوں پر چلے تو آسمان اور زمین اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب درہم برہم ہو جائے۔

(71/المومنون)

دعا کے لغوی معنی ہیں ''پکارنا''۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ قرآن اسے کن معنوں میں استعمال کرتا ہے۔ خدا کہتا ہے کہ

(ابراہیم نے اپنی قوم سے کہا کہ) میں تم سے بھی تعلق ختم کرتا ہوں اور ان سے بھی (جن سے تم خدا کو چھوڑ کر دعا مانگتے ہو یعنی) جنہیں تم

خدا کو چھوڑ کر ''پکارتے ہو''۔ اور میں اپنے (رب سے دعا مانگتا ہوں یعنی) رب کو ''پکارتا'' ہوں۔ یقیناً میں اپنے رب کو ''پکار'' کر محروم نہیں رہوں گا۔ چنانچہ جب اس نے ان سے اور ان (معبودوں) سے جنکی وہ ''عبادت'' کرتے تھے تعلق ختم کر دیا تو ہم نے اسے اسحاقؑ اور یعقوبؑ دیے اور سب کو نبی بنایا (48,49/مریم)

غور کیجئے۔ پہلے یہ کہا گیا کہ ''ان سے بھی تعلق ختم کرتا ہوں جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو'' اور پھر یہ کہا گیا کہ ''ان سے بھی تعلق ختم کر دیا جنکی وہ عبادت کرتے ہیں''۔ یعنی قرآن کی رو سے ''پکارنے'' (یعنی دعا کرنے) کا بھی وہی مطلب ہے جو ''عبادت'' کا ہوتا ہے۔

اور یہ آیت دیکھیے کہ

''اے محمدؐ ان لوگوں سے کہہ دو کہ مجھے ان (معبودوں) کی ''عبادت'' کرنے سے منع کیا گیا ہے جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر ''پکارتے'' ہو۔ کہ میرے پاس خدا کی طرف سے واضح دلیلیں آ چکی ہیں اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں خدائے رب العالمین کی فرماں برداری کروں'' (66/المومن نیز دیکھئے 71/الانعام)

اس آیت سے بلا تبصرہ یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خدا کے نزدیک ''دعا (پکارنا)'' کا وہی مطلب ہے جو ''عبادت'' کا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو پکارنے (یعنی خدا سے دعا کرنے) اور خدا کی عبادت کرنے کا مطلب خدا کی فرماں برداری (یعنی قرآن کی اطاعت) کرنا ہے۔

اور یہ آیت پر توجہ دیجئے کہ

''(اہل جنت اپنے جنتی ہونے کی وجہ یہ بتائیں گے کہ) ہم اس سے

پہلے (یعنی دنیاوی زندگی میں) خدا سے دعا (یعنی خدا کو پکارا) کرتے تھے'' (28/الطّور)

یہاں تو یہ بات بالکل ہی صاف ہو جاتی ہے کہ قرآن کی رو سے خدا کو پکارنے کا مطلب قرآن (یعنی قانونِ خداوندی) کی اطاعت کرنا ہے کیونکہ ہاتھ اٹھا کر جنت کی خواہش کر لینے سے جنت نہیں مل جاتی۔ قرآنِ کریم کے اپنے بقول جنت تو احکام الٰہی (یعنی قرآن) کی پیروی کرنے سے ملتی ہے (25,82/البقرۃ، 57,122/النساء، 42/الاعراف، 23/ابراہیم، 60/مریم وغیرہ وغیرہ)۔

آپ نے دیکھا کہ مروجہ مفہوم کے مطابق ''دعا'' نام ہے کسی چیز کی خواہش کرنے کا جبکہ قرآنی مفہوم کے مطابق ''دعا'' قانون خداوندی کے تحت کسی خواہش کو حاصل کرنے کی ''عملی کوشش'' کو کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت نوحؑ کے دل میں اپنی ظالم قوم سے نجات حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی تو انہوں نے (قرآن کے بقول) یوں دعا کی کہ

خدا کی نگرانی میں خدا کی وحی کے مطابق ایک کشتی بنائی۔ پھر جب خدا کے حکم (قانونِ خداوندی) کے مطابق پانی کے چشمے جوش مارنے لگے (اور سیلاب امڈ آیا) تو (انہوں نے خدا کی ہدایت کے مطابق) ہر (ضروری) شے کے دو دو جوڑے لیے اور اپنے رفقائے کار کے ہمراہ کشتی میں بیٹھ گئے لیکن اسے اپنے ساتھ نہیں بیٹھنے دیا جس کے کفر نے پہلے سے ہی بتا رکھا تھا کہ وہ اگلی جماعت میں شامل نہیں ہوگا۔ (چنانچہ آپؑ اور آپؑ کے رفقائے کار محفوظ رہے) اور جنہوں نے سرکشی پر کمر باندھ رکھی تھی وہ سب کے سب (طوفان میں) غرق ہو گئے'' (27/المومنون)

خدا کہتا ہے کہ

نوحؑ نے (اپنی ظالم قوم کے خلاف) ہم سے دعا کی (ہمیں پکارا)۔
اور دیکھو کہ ہم نے کس طرح اس کی دعا قبول کی۔ اور اسے اور اس
کے رفقائے کار کو بڑی مصیبت سے نجات دی۔

(الصفت/75,76)

اب تو آپ دعا کرنے اور دعا قبول ہونے کی قرآنی مفہوم کو سمجھ ہی چکے ہونگے، کہ حضرت نوحؑ نے قانون خداوندی (جس کے تحت کشتی بنا کر ہی طوفان سے بچا جا سکتا تھا) کے مطابق ظالم قوم اور طوفان سے بچنے کی عملی کوشش (دعا) کی اور خدا کے بنائے ہوئے قانون مکافاتِ عمل (law of cause and effect) کی وجہ سے ان کا درست اقدام از خود کامیابی سے ہمکنار ہو گیا (ان کی دعا خود بخود پوری ہو گئی)، ورنہ اگر حضرت نوحؑ کشتی بنانے اور اس پر بیٹھنے کے بجائے ہاتھ اٹھا کر مروجہ مفہوم والی دعا ہی مانگتے رہتے تو کیا وہ اور ان کے ساتھ بچ سکتے تھے؟

یعنی قرآن کی رو سے زخمی ہاتھ کو ٹھیک کرنے کی دعا یہ ہے کہ اس پر صحیح دوائی لگائی جائے، اور اگر اس دعا میں خلوص ہو یعنی صحیح وقت پر صحیح دوائی لگائی گئی تو مکافاتِ عمل کے تحت یہ دعا اپنے آپ یوں قبول ہو گی آپ کا زخم از خود بھر جائے گا۔

جہاں تک دعا کے مروجہ مفہوم (یعنی کسی چیز کی آرزو کرنے) کا تعلق ہے تو یہ اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اگر کسی شے کو پانے کی آرزو ہی نہ ہو تو اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اُس شے کو پانے کی عملی کوشش کی جائے۔ جس شے کی آرزو جتنی گہری ہو گی اُسے پانے کی عملی کوشش (یعنی دعا) بھی اُتنی ہی تیز ہو گی۔

حضرت علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا کہ

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

اب آیئے منظر اور اظفر کے معاملے کی طرف۔ تو بات یہ ہے کہ خدا پر توکل کا مطلب وہ ہرگز نہیں جو منظر نے مولوی صاحب سے سیکھ لیا ہے۔ کاش اسے معلوم ہوتا کہ

ایک بدو اپنے اونٹ کو کھلا چھوڑ کر، حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو حضور اکرمؐ نے اس سے یہ پوچھا کہ اس نے اونٹ کو رسی سے کیوں نہیں باندھا (کہ اس طرح اونٹ بھاگ بھی سکتا تھا)؟ بدو نے جواب دیا کہ ''اُس نے اونٹ کو خدا کے توکل پر کھلا چھوڑ دیا ہے''۔ اس پر حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ ''جاؤ، پہلے اونٹ کو رسی سے باندھو پھر خدا پر توکل کرو۔

آپ خود ہی سوچیے کہ منظر نے امتحان میں کامیابی کی دعا کی ہی کب تھی جو قبول ہوتی اور وہ امتحان میں کامیاب ہوتا۔ منظر نے جسے دعا سمجھ لیا وہ تو منظر کے دل کی ایک خواہش تھی۔ امتحان میں کامیابی کی دعا کی تو یہ ہے کہ صحیح کتابوں کا صحیح طریقے سے مطالعہ کیا جائے اور یہ دعا اظفر نے کی تھی جو خود بخود قبول ہوگئی کیونکہ

خدا ہر دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہے (186 / البقرۃ)

سب سے بڑی سنت

برناڈ شا نے کہا تھا کہ ''اسلام وہ واحد مذہب ہے جس میں یہ صلاحیت ہے کہ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دے سکے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا پیغام ہر زمانے کے لوگوں کو اپیل کر سکتا ہے''۔

اسلام بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ اس لیے دے سکتا ہے کہ اس دستورِ حیات کی تفاصیل بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ وہ اسطرح کہ قرآن نے وہ اصول تو از خود طے کر دیے جن کے تحت نظام خداوندی (اسلامی معاشرہ) قائم ہوتا ہے لیکن ان اصولوں کی تفاصیل (عمومی طور پر) از خود طے نہیں کیں تا کہ ہر زمانے کے لوگ ان تفاصیل کو اپنے اپنے مخصوص حالات کے مطابق طے کر سکیں اور اسلام کا پیغام کسی ایک زمانے میں محدود ہونے کے بجائے ہر زمانے کے لوگوں کو اپیل کر سکے۔

مثال کے طور پر قرآن نے یہ تو طے کر دیا کہ جنگ کے قیدیوں کو یا بطور احسان یا فدیہ لے کر آزاد کر دیا جائے (4/ محمد) لیکن فدیہ کی مالیت اس منشاء کے تحت طے نہیں کی کہ ہر زمانے کے لوگ اسے اپنی ضروریات کے مطابق طے کر سکیں۔ چنانچہ حضور اکرمؐ نے اپنے وقت اور حالات کے مطابق فدیہ کی رقم ایک دینار فی کس مقرر فرما کر قرآن کی منشاء پوری کی اور حضرت عمرؓ نے اپنے وقت اور حالات کے مطابق مختلف ممالک کے لئے فدیہ کی مختلف شرحیں مقرر فرما کر قرآن وسنت کی منشاء پوری کر دی۔

قرآن کہتا ہے کہ

(زندگی کے اصول غیر متبدل ہوتے ہیں لیکن ان اصولوں کی تفاصیل وقت اور حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں لہذا) اے مومنو! جن چیزوں کی تفصیل ہم نے (قرآن میں) نہیں دی ان کے بارے میں کرید کرید کر مت پوچھا کرو کہ اگر ہم نے ان تفاصیل کو بھی متعین کر دیا تو (وہ بھی غیر متبدل قرار پا جائیں گی اور جب وہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکیں گی تو ان پر عمل کرنا تمہارے لئے مشکل ہو جائے گا اور اسطرح) وہ تفاصیل تم پر ناگوار گزریں گی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب نزول وحی کا سلسلہ جاری ہے تو تمہارے اصرار پر ان امور کو بھی ظاہر کر دیا جائے گا۔ بہرحال تم اسکا خیال رکھو۔ جو کچھ اس سے پہلے ہو چکا ہے اس سے ہم درگزر کرتے ہیں۔ خدا کے قانون میں سابقہ غلطیوں کی معافی اور چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے بردباری کی گنجائش ہے۔ (یاد رکھو کہ) یہ جو تنبیہ تمہیں کی گئی ہے تو اس لیے کہ تم سے پہلے ایک قوم (بنی اسرائیل) نے اس قسم کے سوالات پوچھنے شروع کر دیئے تھے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے اوپر اتنی قیود و پابندیاں عائد کر دیں کہ جنکا نباہنا انکے لئے مشکل ہو گیا (اور وہ ان تفاصیل کی پابندی سے گھبرا کر) اصل دین سے ہی منحرف ہو گئے (101,102/المائدۃ)۔

آپ خود ہی سوچیے کہ قرآن میں جہاں یہ کہا گیا کہ ''(نظام خداوندی کے قیام کیلئے یعنی) خدا کی راہ میں (بوقت ضرورت) جنگ کرو'' (216,244/البقرۃ وغیرہ)۔ اگر وہاں یہ بھی کہہ دیا جاتا کہ یہ جنگ تلواروں اور تیروں کی مدد سے کرو تو کیا آج کے ایٹمی

دور میں اس ہدایت پر عمل کرنا ممکن تھا؟

حقیقت یہ ہے کہ اگر خدا قرآن میں مذکور ہر اصول کی تفصیل بھی خود ہی طے کر دیتا تو انسانیت یا اسلام سے منحرف ہو جاتی یا آج بھی وہیں کھڑی ہوتی جہاں آج سے چودہ سو سال پہلے کھڑی تھی۔

قرآن کے بقول خدا (سیدھے اور ہموار راستے) صراط مستقیم پر بھی ہے (56/ھود) اور (سیڑھیوں والا خدا) ذی المعارج بھی ہے (3/المعارج)۔ یعنی خدا (صراط مستقیم پر ہونے کے ناطے) اشیائے کائنات کو آگے بڑھانے والا بھی ہے اور (ذی المعارج ہونے کے ناطے) انہیں بتدریج بلندی کی طرف لے جانے والا بھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ خدا یہ چاہتا ہے کہ انسان صراط مستقیم پر بھی رہے اور صراط مستقیم پر رہتے ہوئے اپنے ارتقائی مراحل بھی طے کرے۔

انسان صراط مستقیم پر اسطرح رہ سکتا ہے کہ وہ قرآنی ہدایت کے مطابق اچھے کام کرے اور صراط مستقیم پر رہتے ہوئے اپنے ارتقائی مراحل یوں طے کر سکتا ہے کہ ہر اچھا کام جدید سے جدید اور عمدہ سے عمدہ طریقے سے کرے۔ مثال کے طور پر اسلامی معاشرے کے قیام کے لئے بوقت ضرورت جنگ کرنے سے انسان صراط مستقیم پر رہتا ہے اور اس جنگ کو جدید سے جدید اور عمدہ سے عمدہ ہتھیاروں و حکمت عملی کے ساتھ کرنے سے ارتقائی مراحل طے کرتا ہے۔

خدا نے نظام خداوندی یعنی اسلامی معاشرے کے اصول از خود اس لیے طے کیے کہ (ان اصولوں پر عمل کر کے) انسان صراط مستقیم پر رہے اور ان اصولوں کی تفاصیل از خود اس لئے طے نہیں کیں کہ (ان تفاصیل کو اپنے وقت اور حالات کے مطابق خود طے کر کے) انسان ارتقائی مراحل طے کرتا رہے۔

علامہ اقبالؒ اس باب میں لکھتے ہیں کہ

''اسلام کی رو سے تمام زندگی کی روحانی اصل ابدی ہے جو اپنا اظہار تنوع اور تبدیلی میں کرتی ہے۔ لہذا جو معاشرہ حقیقت کے ایسے تصور پر مبنی ہو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ثبات اور تغیر میں توافق پیدا کرے۔ ضروری ہے کہ اس کے پاس اجتماعی زندگی کو منظّم کرنے کے لئے ابدی اصول ہوں کیونکہ مسلسل تبدیلی کی اس دنیا میں ابدی اقداروں سے وابستگی ہی استقامت بخشتی ہے لیکن ابدی اصولوں کو جب اس طرح سمجھا اور برتا جائے کہ ان سے تبدیلی کے تمام امکانات، جو (از روئے قرآن) اللہ کی عظیم نشانیوں میں سے ایک ہیں ختم ہو جائیں، تو یہ اصولِ زندگی کو، جو فطرتاً حرکت و قوت ہے، جامد و بے جان بنا دیتے ہیں۔ یورپ اس لئے ناکام ہوا کہ اس نے ابدی اصولوں کی قدر و قیمت نہیں جانی اور گزشتہ پانچ سو سال سے اسلام پر اس سبب سے جمود طاری ہے کہ مسلمانوں نے تغیر کی اہمیت کو نہیں سمجھا'' (خطبات، صفحہ 147۔ فکری اسلامی کی تشکیل نو، صفحہ 153)

اسی بات کو اقبال اشعار کی زبان میں یوں بیان کرتے ہیں کہ

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظامِ جمہوری
نہ مشرق اس سے بری ہے نہ مغرب اس سے بری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری

....

ضمیرِ مغرب ہے تاجرانہ ضمیرِ مشرق ہے راہبانہ
وہاں دگرگوں ہے لحہ لحہ یہاں بدلتا نہیں زمانہ

....

تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ

....

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خود کشی

....

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے
افلاک منور ہو ترے نورِ سحر سے

آسان لفظوں میں یوں کہیے کہ نبی اکرمؐ کی نبوت کا مقصد یہ ہے کہ نوع انسانی کو آگے کی طرف بھی بڑھایا جائے اور بلندی کی طرف بھی لے جایا جائے یعنی صراطِ مستقیم پر بھی چلایا جائے اور ارتقائی مراحل سے بھی گزارا جائے۔ اسی لیے قرآن کریم آپ کو ''مدثر'' کہہ کر پکارتا ہے (1/المدثر) کہ آپ کے ذمے بے راہ روی (یعنی ملوکیت/فرعونیت، مذہبی پیشوایت/ہامانیت اور سرمایہ پرستی/قارونیت) کا خاتمہ کر کے انسانیت کو سنوارنے اور قدامت پسندی کا خاتمہ کر کے ایک نیا جہان پیدا کرنے کا فریضہ عائد تھا۔

چناچہ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

....

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

....

ندرتِ فکر عمل کیا شے ہے؟ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر وعمل کیا شے ہے؟ملت کا شباب
ندرتِ فکر وعمل سے معجزاتِ زندگی
ندرتِ فکر وعمل سے سنگِ خارا لعلِ ناب

اس حقیقت سے کسے اختلاف ہوسکتا ہے کے زمانے کی گود میں حضرت محمدؐ سے بڑے جدت پسند نے آنکھ نہیں کھولی۔ بڑے بڑے غیر مسلم مصنفین بھی اس باب میں لکھتے ہیں کہ

''محمدؐ کا برپا کردہ انقلاب عربوں کے لئے ایک نئی زندگی تھا جو انہیں تاریکی سے نور کی طرف لے آئی''

(Thomas Carlyle-Heroes and Hero worship/ p#66)

''اسلام مذہبی زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے''

(Tor Andre-Mohammad The Man And His Faith/ p#1)

''محمدؐ اس معاشرتی اور بین الاقوامی انقلاب کے بانی ہیں جس کا سراغ اس سے قبل تاریخ میں نہیں ملتا''

(Raymond Lerouge-life De Mohammet-p#18,19)

''قرآن نے انسانیت کو ایک نئی فکر سے روشناس کرایا اور اسے ایک

جدید انداز کی سیرت عطا کی''

(Margoliouth)

''محمدؐ کے مذہب نے اس حقیقت و اولین جمہوریت کا اعلان کیا جو
کسی انسان کے ذہن میں (ازخود) نہیں آسکتی تھی''

(Dr. Mawde Royden-The Problem of Palestine/ p#37)

''اسلام نے عدل وانصاف کے عصر جدید کا اعلان کر دیا''

(George Rivorie-Visages Del Islam)

''اس نا قابل فراموش انقلاب نے اقوام عالم (کے قلب) پر ایک
نرالا لیکن دائمی نقش ثبت کر دیا''

(Gibbon-Rise and Fall of Roman Empire-p#252,255,287)

''نوع انسانی نیستاں کی طرح ایک شرارے کی منتظر تھی۔ وہ بجلی کا
شرارہ اس بطلِ جلیل (محمدؐ) کی صورت میں آسمان سے آیا اور ساری
نوع انسانی کو شعلہ صفت بنا گیا

(Thomas Carlyl-Heroes and Hero Worship)

''چند ہی سال کے عرصے میں دنیا کا بیشتر حصہ (انقلاب محمدی کی وجہ
سے) قدیم دنیا کے بجائے بالکل نئی دنیا بن گیا''

(Pringle Kennedy-Arabian Society At The Time of Mohammad-p#9/18)

''ازمنۂ متوسطہ میں جو ترقیاں ہوئیں وہ محمدؐ کے لائے ہوئے

انقلاب کا نتیجہ ہیں''

(Hearushaw-The Science Of History)

''اگر عرب (انقلاب محمدی سے بیدار) نہیں ہوئے تو یورپ کی تہذیب کا وجود عمل میں نہیں آتا۔عربوں کے بغیر یورپ یقیناً اس خصوصیت کو حاصل نہیں کر سکتا تھا جس نے اسے ارتقائی مراحل کی بلند ترین سطح پر لا کھڑا کیا''

(Briffault-The Making Of Humanity-p#183)

حضرت علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا کہ

جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ

....

وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

آپ نے دیکھا کہ جانے مانے غیر مسلم اربابِ نظر بھی اس بات پر متفق ہیں کہ ترقی پسندی اسلام کا محور ہے اور حضور اکرمؐ ترقی پسندی کا محور ہیں۔آپؐ ہی تو تھے جنہوں نے قدامت پسندی کی صدیوں پرانی زنجیروں کو پاش پاش کر کے ان کی قید میں سسک سسک کر دم توڑتی ہوئی انسانیت کو ایک نئی زندگی عطا کی؟ کیا آپ کو یاد نہیں جن لوگوں نے نبی کریمؐ کی مخالفت کی وہ تمام کے تمام لکیر کے فقیر تھے۔

قرآن کے بقول

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو ہدایت نازل کی ہے اس

کی پیروی کرو (عقل استعمال کرو اور ترقی کی راہ پر چلو) تو کہتے ہیں
کہ نہیں (ہم جہالت و قدامت کی راہ پر ہی خوش ہیں)۔ ہم تو اسی
طریقے پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو چلتے دیکھا
ہے (170/البقرۃ، 104/االمائدہ، 21/لقمان)

تاریخ جانتی اور قرآن گواہ ہے کہ حضور اکرمؐ کی ساری زندگی قدامت پسندی کے خلاف جہاد کرتے ہوئے گزری لیکن آپؐ کے امتی ایک کثیر تعداد میں خلوص نیت سے نہ صرف قدامت پرست ہیں بلکہ قدامت پرست ہونے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ ٹوتھ برش نہیں کرتے، مسواک کرتے ہیں اور اسکی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ٹوتھ برش کرنا سنت نہیں جبکہ مسواک کرنا سنت ہے۔ اور اگر اس قسم کے سوال پوچھ لیے جائیں کہ اسطرح کی سنت تو گھوڑوں اور اونٹوں پر سفر کرنا بھی ہے پھر آپ حضرات گاڑیوں اور جہازوں پر سفر کیوں کرتے ہیں؟ اور اسطرح کی سنت تو تلواروں اور تیروں سے جہاد کرنا بھی ہے پھر آپ حضرات جہاد میں بندوقوں اور میزائیلوں کا استعمال کیوں کرتے ہیں؟ تو جواب دیتے ہیں کہ حضور اکرمؐ کے زمانے میں گاڑیاں اور جہاز تھے ہی کہاں جو وہ ان پر سفر کرتے؟ اور بندوق اور میزائل تو تلوار اور تیر ہی کی جدید شکل ہیں۔

اگر حضور کے زمانے میں گاڑیاں اور جہاز نہیں تھے تو کیا ٹوتھ برش تھا جو حضورؐ اسے استعمال کرتے؟ اور اگر بندوق اور میزائیل تلوار اور تیر کی جدید شکل ہیں تو کیا ٹوتھ برش اور ٹوتھ پیسٹ مسواک کی جدید شکل نہیں؟

اقبال نے یونہی تو نہیں کہا کہ

آئین نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو
آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور

بات یہ ہے کہ حضورؐ نے مسواک اس لیے استعمال کیا کہ ان کے زمانے میں دانت صاف کرنے کا سب سے عمدہ طریقہ یہی تھا، بالکل ویسے ہی جیسے اس زمانے میں سفر کا سب سے عمدہ ذریعہ گاڑیاں اور اونٹ تھے۔

آپؐ کے زمانے میں جہاز اور گاڑیاں ہوتے تو اس حقیقت سے کسے اختلاف ہو سکتا ہے کہ آپؐ ان کے سفر کو اونٹوں اور گھوڑوں کے سفر پر ترجیح دیتے؟ اسی طرح اگر اُن دنوں دانت صاف کرنے کے لیے مسواک سے بہتر کوئی چیز میسر ہوتی تو نبی کریمؐ یقیناً اسی سے استفادہ کرتے؟

حیرت کی بات یہ ہے کہ جو لوگ مسواک چھوڑنے کو تیار نہیں وہی لوگ دانتوں کی کسی بیماری میں مبتلا ہو جائیں یا ان کے دانتوں کو گہری صفائی کی ضرورت ہو تو فوراً ڈینٹسٹ (Dentist) کے پاس دوڑتے ہیں اور اتنا بھی نہیں سوچتے کہ ڈنٹسٹ کے اوزار بھی تو مسواک ہی کی ایک شکل ہے؟

کاش ہم لوگ اس حقیقت کا ادراک کر سکیں کہ حضورؐ نے جو کام بھی کیا وہ اپنے وقت اور حالات کے مطابق سب سے عمدہ طریقے سے کیا اور انکے نقش قدم پر چلنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ انکا کیا ہوا ہر کام اپنے وقت اور حالات کے مطابق سب سے عمدہ طریقے سے کیا جائے۔ اسی کو ترقی پسندی کہتے ہیں اور یہی حضور اکرمؐ کی سب سے بڑی سنت ہے۔

خیر و شر

ایک زمانہ وہ تھا کہ محبت خان ہر نماز جماعت کے ساتھ پڑھا کرتا تھا اور ایک زمانہ یہ ہے کہ وہ کوئی نماز پڑھتا ہی نہیں۔ مولوی صاحب کے ایک خطبے نے اسے خدا سے ناراض کر دیا ہے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ ''خیر'' کے ساتھ ساتھ ''شر'' بھی خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور محبت خان نے اپنی تمام پریشانیوں کا ذمہ دار خدا کو سمجھ لیا۔

محبت خان کہتا ہے کہ

.... اگر خدا سانپ کو زہر ہی نہ دیتا تو اس کا والد سانپ کے ڈسنے سے ہلاک کیوں ہوتا؟

.... اگر خدا زیادہ بارشیں ہی نہ برساتا تو اس کا مکان ملبے کا ڈھیر کیوں بنتا، جس میں دب کر اس کی والدہ جاں بحق ہوئی؟

.... اور اگر خدا اسے غریب ہی نہ بناتا تو اسے والدین کی ہلاکت کے بعد تعلیم چھوڑ کر مزدوری کیوں اختیار کرنی پڑتی؟

مولوی صاحب کی کم علمی محبت خان کو کہاں سے کہاں لے آئی؟ وہ ذہن جو خدا کے خیال سے سلجھا ہوا تھا خدا ہی کے خیال سے الجھ گیا، وہ دل جو خدا کی یاد سے سرشار و سرمست رہتا تھا خدا ہی کی یاد سے ہی وحشت زدہ رہنے لگا۔ اور وہ زبان جو خدا کے حضور ثنا سنج ہوتی تھی خدا ہی کے حضور ہی شکوہ سنج ہو گئی۔

لیکن محبت خان غلط تو نہیں کہتا۔ آپ خود ہی سوچیے کہ اگر مولوی صاحب کی اس بات کو درست تسلیم کر لیا جائے کہ 'شر' خدا کی طرف سے ہوتا ہے تو محبت خان کی یہ بات کیسے غلط قرار دی جا سکتی ہے کہ اگر خدا 'شر' کو پیدا ہی نہ کرتا تو کوئی 'شر' کا شکار ہی کیوں ہوتا؟

کیا معلوم کہ محبت خان کے مولوی صاحب کی نگاہ سے کبھی قرآنِ کریم کی یہ آیاتِ مبارکہ بھی گزریں کہ

جب ہم انسانوں کو اپنی رحمت سے لطف اندوز کرتے ہیں تو وہ اِترانے لگتے ہیں اور جب انہیں اپنی خود کردہ غلطیوں کی وجہ سے شر (نقصان) پہنچتا ہے تو وہ مایوس ہو کر بیٹھ جاتے ہیں (36/الروم)

جب ہم انسان کو اپنی نعمتوں سے نوازتے ہیں تو وہ اعراض برتتا ہے اور بے رخی کر لیتا ہے اور جب اسے (اپنی اس غلطی کی وجہ سے) شر (نقصان) پہنچتا ہے تو ناامید ہو جاتا ہے (83/بنی اسرائیل، 51/حم السجدۃ)۔

غور کیجئے کہ خدا ''خیر'' کو تو اپنے سے منسوب کرتا ہے لیکن ''شر'' کو (اپنے سے نہیں بلکہ) انسان سے منسوب کرتا ہے۔

اور یہ آیت دیکھیے کہ

زرخیز زمین خدا کے اذن سے نہایت عمدہ فصل دیتی ہے لیکن ناقص زمین بہت کم پیداوار دیتی ہے (58/الاعراف)

یہاں بھی کہ زرخیز زمین کیلئے تو یہ کہا گیا کہ وہ خدا کے اذن سے نہایت عمدہ فصل دیتی ہے لیکن ناقص زمین کے لئے یہ نہیں کہا گیا کہ وہ خدا کے اذن سے بہت کم پیداوار دیتی ہے۔

اور اس آیت پر توجہ دیجئے کہ

تمھیں جو خوشگواریاں ملتی ہیں وہ خدا کی طرف سے ہوتی ہیں اور تم پر جو مصیبتیں آتی ہیں وہ تمھارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہیں (79/النساء)۔

شر خدا کی طرف سے ہو ہی کیسے سکتا ہے جبکہ خدا خیر ہی خیر ہے۔قرآن ہی کے بقول

.... خدا خیر وابقی ہے(73/طہ)

.... خدا خیر الرازقین ہے(114/المائدۃ،58/الحج،72/المومنون وغیرہ)

.... خدا خیر الماکرین ہے(54/ال عمران،30/الانفال)

.... خدا خیر الفاتحین ہے(89/الاعراف)

.... خدا خیر الغافرین ہے(155/الاعراف)

.... خدا خیر الوارثین ہے(89/الانبیاء)

.... خدا خیر الراحمین ہے(109,118/المومنون)

.... خدا خیر الناصرین ہے(150/ال عمران)

.... خدا خیر الفاصلین ہے(57/الانعام)

خدا خیر الحاکمین ہے(87/الاعراف،109/یونس،80/یوسف)۔

تو آپ خود ہی فرمایئے کہ کیا ''شر'' کو خدا سے منسوب کرنا خدا کی شان میں ایک بہت بڑی گستاخی کرنے کے مترادف نہیں جبکہ خدا کے اپنے بقول

''خدا کے ہاتھ میں (شر نہیں بلکہ) خیر ہے(26/ال عمران) اور خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب (قرآن) بھی خیر ہے(30/النحل

نیز دیکھیے 58/یونس، 105/البقرۃ)؟

قرآن خیر ہے لہذا جو کوئی قرآن کی پیروی و اطاعت کرے گا اسے خیر ملے گی اور جو قرآن کی پیروی و اطاعت نہیں کرے گا وہ شر کا شکار ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر قرآن اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی ہدایت کرتا ہے (274/البقرۃ، 134/ال عمران، 22/الرعد وغیرہ) لہٰذا 'انفاق' کی روش خیر کی روش (121/التوبۃ) اور ''بخل'' کی روش شر کی روش ہے (180/ال عمران)۔

آسان لفظوں میں یوں کہیے کہ خیر وہ راستہ ہے جو خدا نے انسان کیلئے منتخب کیا اور شر وہ راستہ ہے جو (خدا کے منتخب کردہ راستے کے برعکس) انسان خود اپنے لیے منتخب کرتا ہے۔

اس بات کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ کوئی شے بھی بذات خود نہ خیر ہوتی ہے نہ شر، اس کے استعمال کا طریقہ اسے خیر یا شر بنا دیتا ہے۔ یہ طریقہ قرآنی تعلیمات کے مطابق ہو تو وہ شے خیر کہلائے گی اور اگر قرآنی تعلیمات کے خلاف ہو تو وہ شے شر بن جائے گی۔ مثال کے طور پر بندوق ظلم کے خلاف اٹھائی جائے تو وہ خیر کہلائے گی اور ظلم کی حمایت میں اٹھائی جائے تو شر بن جائے گی۔

اب آیئے محبت خان کے شکووں کی طرف۔ اس کا پہلا شکوہ یہ ہے کہ اگر خدا سانپ کو زہر ہی نہ دیتا تو اس کا والد سانپ کے ڈسنے سے ہلاک کیوں ہوتا؟ یعنی محبت خان کے خیال میں سانپ کا زہر خدا کا تخلیق کردہ شر ہے۔ کاش اس کی بصیرت تک قرآن کی یہ آیات پہنچ سکیں کہ

> ''خدا نے کائنات کو بالحق پیدا کیا'' (85/الحجر) (لیکن یہ بات فکر و تحقیق سے ہی سمجھی جا سکتی ہے اور) حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ عقل و

بصیرت سے کام لیتے ہیں ان کے لیے آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور دن رات کے بدل بدل کر آنے میں (سچائی تک پہنچنے کیلئے) نشانیاں ہیں (190/ال عمران) (یہ عقل و بصیرت سے کام لینے والے وہ لوگ ہیں) جو اٹھتے بیٹھتے لیٹتے (یعنی زندگی کے ہر گوشے میں) خدا کو یاد کرتے ہیں (یعنی آئینِ الٰہی کو سامنے رکھتے ہیں) اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور و فکر کرتے ہیں (اور اپنی تحقیق کے بعد بصیرت کی بنیاد پر پکار اٹھتے ہیں) کہ اے ہمارے رب تو نے کائنات کو بے کار و بے فائدہ پیدا نہیں کیا۔ تُو اس سے بہت بلند ہے (کہ کائنات کی کسی شے کو منفی نتائج مرتب کرنے کیلئے پیدا کرے۔ یہ ہماری اپنی کم علمی ہے کہ ہم فکر و تحقیق سے کام نہیں لیتے اور اسطرح اشیاء کائنات کے فائدہ مند پہلوؤں سے بے خبر رہ کر عذاب کی زندگی گزارتے ہیں) تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم (عملی تجربات و تحقیقات کے بعد اشیاء کائنات سے درست طور پر فائدہ اٹھائیں اور اسطرح) تباہ کن عذاب سے محفوظ رہیں'' (191/ال عمران)۔

کاش محبت خان کو معلوم ہوتا کہ سانپ کے زہر پر فکر و تحقیق سے پتہ چلا کہ یہ شر نہیں بلکہ خیر ہے اور اس سے کئی مہلک بیماریوں کا تریاق تیار کیا جا سکتا ہے، اور پھر زندگی بچانے والی کئی نایاب ادویات سانپ کے زہر سے تیار کی جانے لگیں۔

جہاں تک محبت خان کے والد کی ہلاکت کا تعلق ہے تو اسکی وجہ سانپ نہیں بلکہ اس کے والد کی لاپروائی ہے۔ آپ خود ہی سوچیے کہ اگر اس کا والد زمین کی طرف دیکھ کر چلتا اور پاؤں سانپ پر نہ رکھتا تو سانپ اسے کیوں ڈستا؟ اور اگر سانپ کے ڈسنے کے بعد وہ بر

وقت علاج تک پہنچ جاتا تو اسے موت کیوں آتی ؟

محبت خان کی دوسری شکایت یہ ہے کہ اگر خدا زیادہ بارشیں نہ برساتا تو اس کا مکان ملبے کا ڈھیر کیوں بنتا کہ جس میں دب کر اس کی والدہ جاں بحق ہوئی۔ تو بات یہ ہے کہ اس کا مکان زیادہ بارشوں کی وجہ سے نہیں گرا بلکہ اس لیے گرا کہ وہ کچا تھا۔ آپ خود ہی فرمایئے کہ اگر اس کا مکان پختہ ہوتا تو کیا وہ بارشوں سے گر سکتا تھا؟

محبت خان کی تیسری شکایت یہ ہے کہ اگر خدا اسے غریب نہیں بناتا تو اسے والدین کی ہلاکت کے بعد تعلیم چھوڑ کر مزدوری کیوں اختیار کرنی پڑتی ؟ یہ شکوہ بھی درست نہیں کیونکہ محبت خان کو خدا نے غریب نہیں بنایا بلکہ ظلم و تفریق پر مبنی اس غیر اسلامی و غیر انسانی معاشرے نے غریب بنایا جس میں وہ جی رہا ہے۔ ورنہ اسلامی معاشرہ تو عدل و مساوات پر مبنی ہوتا ہے جس میں ہر کسی کو ایک جیسی سہولیات میسر ہوتی ہیں۔ نہ کوئی امیر ہوتا ہے نہ کوئی غریب۔ نیز اسلامی معاشرے میں محبت خان جیسے لوگوں کی کفالت ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے اور تعلیم کی مفت سہولت فراہم کرنا بھی ریاست ہی کے فرائض میں شامل ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ شر کے منجانب اللہ ہونے کا عقیدہ دراصل بادشاہوں، سرمایہ پرستوں اور مذہبی پیشواؤں (قرآن کی اصطلاح میں مترفین) نے سیدھی سادی عوام کے دلوں میں اس لیے راسخ کیا کہ لوگ اپنی مصیبتوں اور پریشانیوں کا ذمہ دار خدا کو سمجھتے رہیں اور اس حقیقت کی طرف کسی کی توجہ ہی نہ جائے کہ اس غربت و افلاس کے پیچھے دراصل مترفین کا ہاتھ ہے (مترفین کے بارے میں تفصیل سے بات ''استحصالی ٹولہ'' کے عنوان میں ہوگی)۔

آپ کے ذہن میں رہ رہ کر یہ سوال اٹھ رہا ہوگا کہ کئی لوگ ایسے بھی تو ہوتے ہیں

جو پیدائشی طور پر معزور ہوتے ہیں یا کسی لاعلاج مرض میں مبتلا ہوتے ہیں یا کسی فطری آفت کا شکار ہو جاتے ہیں؟ تو کیا آپ کو یہ معلوم نہیں کہ ترقی یافتہ دنیا میں شادی سے پہلے شادی کے خواہاں افراد کا طبی معائنہ کیا جاتا ہے تا کہ ان امراض کا سراغ لگایا جا سکے جو موروثی طور پر بچوں میں منتقل ہو سکتے ہیں؟ اور پھر ان امراض کا علاج کر کے بچوں کو پیدائشی طور پر معزور ہونے سے بچالیا جاتا ہے؟

کیا آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ جو بیماریاں کل لاعلاج تھیں آج لاعلاج نہیں ہیں اور جو آج لاعلاج ہیں کل لاعلاج نہیں رہیں گی؟ مثال کے طور پر بہت پرانی بات نہیں جب ٹی بی، نمونیہ اور ٹائفائڈ وغیرہ جیسی بیماریاں بھی لاعلاج ہوا کرتی تھیں لیکن اب ان کا علاج بڑی آسانی سے کر دیا جاتا ہے۔

کیا آپ کو اس کا علم بھی نہیں کہ فطری آفات سے جتنا نقصان پہلے ہوتا تھا اب اتنا نہیں ہوتا کیونکہ اب آفات کے آنے سے پہلے ہی ان کے آنے کی خبر آ جاتی ہے؟ نیز تعمیراتی کوڈ میں مناسب ردوبدل سے بھی نقصان کو کم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً 2005 اور 2011 کے زلزلے کو لے لیجئے۔ اول الزکر پاکستان اور ثانی الزکر جاپان میں آیا۔ اول الزکر کی شدت رِکٹر سکیل پر 7.6 جبکہ ثانی الزکر کی شدت 8.9 تھی یعنی جاپان والا زلزلہ پاکستان والے زلزلے سے کہیں زیادہ شدید تھا اس کے باوجود جو نقصان پاکستان میں ہوا اس کا عشرِ عشیر بھی جاپان میں نہیں ہوا۔ کیونکہ جاپان میں عمارتوں کی تعمیر زلزلوں کو ذہن میں رکھ کر کی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ 80 اور 100 منزلہ عمارات بھی محفوظ رہیں جبکہ ہمارے یہاں تعمیرات اتنی ناقص تھیں ایک ایک منزلہ گھر بھی زلزلے کے جھٹکے برداشت نہ کر سکے ۔ جاپان نے اپنے زلزلوں سے سبق سیکھا اور اپنے آپ کو قدرتی آفات کے ساتھ ''ایڈجسٹ'' کرنا شروع کر دیا یعنی اپنے ''لائف سٹائل'' میں تاریخ جغرافیے کے حساب

سے تبدیلیاں کیں، اس کے برعکس ہم ایک قیامت خیز زلزلہ جھیلنے کے بعد بھی لکیر کے فقیر ہی ہیں اور پھر کرپشن اور نااہلی میں بھی تو ہمارا ثانی کوئی نہیں؟ سائنسی ماہرین چیخ چیخ کر تھک گئے ہیں کہ راولپنڈی اور اسلام آباد زلزلے کے حساب سے آج کی دنیا کے خطرناک ترین علاقوں میں سے ایک ہیں لیکن ہمارے ذمہ داران کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی اور اس حوالے سے تاحال کوئی مثبت و موثر پیش رفت سامنے نہیں آسکی؟ یہاں ہونے والی تعمیرات کی اکثریت (خدا کی وجہ سے نہیں بلکہ) ہماری اپنی وجہ سے زلزلہ پروف نہیں۔ اب اگر ایک زلزلہ یہاں بھی آ گیا تو اس سے برپا ہونے والی قیامت خیز تباہی کے ذمہ دار ہم ہوں گے یا ہمارا خدا؟

قرآن کہتا ہے کے خدائے بزرگ و برتر نے ساری کائنات انسان کیلئے مسخر کر دی ہے (13/الجاثیۃ) یعنی خدا نے انسان کی سہولت کیلئے تمام اشیائے کائنات کو قواعد و ضوابط کا پابند بنا دیا ہے۔ اب انسان کا کام ان قواعد وضوابط کا علم وادراک حاصل کر کے اشیائے کائنات سے فائدہ اٹھانا ہے۔ اور انسان جس شے کی حقیقت (یعنی اس شے سے وابستہ قواعد وضوابط) کا علم حاصل کر لے گا وہ اس کے لیے خیر بن جائے گی۔

کیا خبر آپ جانتے ہیں کہ انسان نے بحیثیتِ مجموعی ابھی اپنے ذہن کا چوتھائی حصہ بھی درست طور پر استعمال نہیں کیا لیکن وہ کہاں سے کہاں آ گیا؟ تو اگر انسان اپنا پورا ذہن صحیح انداز میں استعمال کر لے، تو ایسی کونسی آفت ہو گی جس کا مداوہ اس کے پاس نہیں ہو؟ جب انسان اپنا سارا ذہن (منفی نہیں بلکہ) مثبت فکر و تحقیق پر سرف کر لے گا یعنی جب اس کی ہر جدوجہد کی حتمی منزل انسانیت کی بھلائی ہو گی، تو یقین مانیے کہ اس کی زندگی سے شر کا نام ونشان تک مٹ جائے گا اور ساری کائنات خیر ہی خیر بن جائے گی۔ یہی وہ منزل ہو گی جہاں انسان اپنی تخلیق کا مقصد پورا کر کے علم وبصیرت کی بنیاد پر اس حقیقت کی تصدیق

کر دے گا کہ

خدا نے کائنات کو بالحق (یعنی خیر/مثبت نتائج کیلئے) پیدا کیا''

(85/الحجر) کہ خدا اس سے بہت بلند ہے کہ وہ کائنات کی کسی شے کو

باطل (شر/منفی نتائج کیلئے) پیدا کرے (191/ال عمران)۔

اور یہی وہ مقام ہوگا جہاں انسان اپنے رب کے حضور سرخرو ہو کر اپنی کھوئی ہوئی جنت دوبارہ حاصل کر لے گا۔

استحصالی ٹولہ

آپ جانتے ہیں کہ قرآن سارے انسانوں کی آزادی کیلئے نازل کیا گیا اور نبیء آخرالزماں ؐ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا گیا کہ

''ان بوجھوں کو اتار دیا جائے جنکے نیچے انسانیت دبی ہوئی ہے اور ان زنجیروں کو توڑ دیا جائے جن میں انسان جکڑا ہوا ہے''

(157/الاعراف)

آپ کو یہ بھی معلوم ہو ہے کہ قرآن کریم کی رو سے وہ زنجیریں تین طرح کی ہیں جنہیں توڑنے سے انسانیت کے سر سے وہ بوجھ اتر جاتا ہے جس نے انسانیت کی کمر توڑ رکھی ہے۔

پہلی زنجیر ''ملوکیت'' کی ہے جو انسان کی طبیعی آزادی کو سلب کر لیتی ہے کہ محکوم لوگ اپنے حاکموں کی مرضی کے مطابق جینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ دوسری زنجیر ''سرمایہ پرستی'' کی ہے جو انسان کو اس کی اخلاقی آزادی سے محروم کر دیتی ہے کہ اس لعنت کے طفیل دولت تمام لوگوں میں گردش کرنے کے بجائے چند ہاتھوں میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے، جس کے سبب کمزور و مجبور لوگ روٹی کے ایک ایک لقمے کو ترستے ہیں۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ بھوک سے بلکتے ہوئے کسی انسان سے روٹی کے ایک ٹکڑے کی خاطر کیا کچھ نہیں کروایا جا سکتا؟ اور تیسری زنجیر ''مذہبی پیشوایت'' کی ہے جو انسان سے اس کی فکری آزادی چھین لیتی ہے کہ عقیدت مندوں کا ایمان اس وقت تک خالص ہی نہیں ہوتا جب تک وہ حضرت

صاحبان کے احکام پر سوچے سمجھے بغیر عمل پیرا نہ ہو جائیں؟

آپ خود ہی سوچیے کہ اس سے بری قید اور کیا ہو سکتی ہے کہ کوئی انسان اپنی زندگی بھی اپنی مرضی سے نہ گزار سکے؟ اس سے سخت عذاب اور کیا ہو سکتا ہے کہ دوسروں کیلئے اناج اگانے والے محنت کشوں کے اپنے بچے روٹی کیلئے ترسیں، دوسروں کیلئے کپڑا بُننے والوں کے اپنے بچوں کے تن پر کپڑا نہ ہو اور دوسروں کیلئے گھر تعمیر کرنے والوں کے اپنے بچے بے گھر ہوں؟ اس سے بڑی قیامت کیا ہو سکتی ہے کہ حکمرانوں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے کتے اور گھوڑے بھی کسانوں اور مزدوروں سے اچھی بلکہ بہت اچھی زندگی گزاریں؟ اور اس سے بڑھ کر انسانیت کی تذلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے آگے سجدے کرے، اس کے قدموں میں بیٹھے اور اُس کی طرف پیٹھ نہ پھیرے؟

علامہ اقبال نے ایک مقام پر کیا خوب فرمایا کہ

یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

اور دوسرے مقام پر کہا کہ

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو دہاتی ہو، مسلمان ہے سادہ
مانندِ بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن

نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقہء سالوس کے اندر ہے مہاجن

قرآن کی رو سے فرعون (88/یونس، 24/طہ) قارون (79-76/القصص) اور ہامان (6-8,38/القصص) بالترتیب ملوکیت، سرمایہ پرستی اور مذہبی پیشوایت کے نمائندے ہیں (39/العنکبوت، 24-23/المومن)۔ فرعون، قارون اور ہامان نے بنی اسرائیل کے حقوق پامال کر کے ان پر مصر کی زمین تنگ کی جبکہ فرعونیت، قارونیت اور ہامانیت ساری انسانیت کا استحصال کر کے نوعِ انساں پر کرہء ارض کو تنگ کر رہی ہے۔

قرآن ملوکیت کی زنجیر کو توڑنے کا حکم یوں دیتا ہے کہ

کسی انسان کو بھی (خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو) اس بات کا حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے اور اس سے اپنی محکومیت کروائے (79/ال عمران) حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے کیونکہ وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے (57/الانعام) اور خدا اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا (26/الکھف) خدا سب کا تنہا حاکم ہے (108/الانبیاء) خدا کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو (40/یوسف، 114/الانعام) (اور خدا کو حاکم بنانے اور اسکی محکومیت اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لو یعنی) قرآن کی اطاعت کرو (3/الاعراف، 55/الزمر) (وہ اسطرح کہ قرآن کو اپنی مملکت کا آئین بنا لو اور) قرآن کے مطابق فیصلے کرو (105/النساء، 76/النمل) یعنی عدل کے مطابق فیصلے کرو (58/النساء، 42/المائدہ)۔

چنانچہ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ
جو (حکمران اپنی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ) اللہ کے کتاب کے موافق تمہیں چلانا چاہے اس کی اطاعت کرو اور اس کی بات سنو (مسلم)

سرمایہ پرستی کی زنجیر کو توڑنے کی ہدایت یوں کی کہ
(پیداوار کے وسائل یعنی زمین، پانی، ہوا وغیرہ خدا کی طرف سے بخشش کے طور پر عطا کیے گئے ہیں اور) جو کچھ خدا کی طرف سے بطور بخشش عطا ہوا ہے (وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتا یعنی) اسکے گرد حصار نہیں کھینچا جاسکتا (20/بنی اسرائیل)

دولت کی گردش ایسی ہونی چاہیے کہ یہ (تمام طبقوں میں مساوی طور پر تقسیم ہو) اوپر کے طبقے میں ہی نہ پھرتی رہے (7/الحشر) اے محمدؐ (جب) یہ تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کتنا مال اللہ کی راہ میں (یعنی معاشرے کی فلاح و بہبود پر) خرچ کریں تو ان سے کہہ دو کہ (انکے پاس انکی) ضرورت سے زیادہ جتنا بھی ہو (219/البقرۃ) اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو خدا کے راستے میں (یعنی دوسروں کی فلاح و بہبود پر) خرچ نہیں کرتے ان کو اس دن کے الم ناک عذاب کی خبر سنا دو (34/التوبۃ) جس دن (یعنی حشر میں ان کا اکٹھا کیا ہوا) وہ مال جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور اس سے ان کی پیشانیاں، ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی (اور ان سے کہا جائے گا کہ) یہ وہی مال ہے جو تم نے (تنہا)

اپنے لیے جمع کیا تھا، سو اب اس کا مزہ چکھو (35/التوبۃ)

چنانچہ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ

دینار و درہم کے بندوں پر لعنت کی گئی ہے (ترمذی۔مشکوۃ) مال بڑھانے والے، فخر کرنے والے اور دولت مندی دکھانے والے سے خدا ناراض ہوگا (بیہقی۔شعب الایمان۔مشکوۃ)

مذہبی پیشوایت کی زنجیر کو توڑنے کی تاکید یوں کی کہ

(خدا تک پہنچنے کیلئے کسی ذریعے یا وسیلے کی ضرورت نہیں کیونکہ) خدا ہر پکارنے والے کی پکار (قانون مکافات عمل کے ذریعے براہ راست) سنتا ہے (186/البقرۃ) (خدا تک پہنچنے کیلئے کسی کو ذریعہ بنانا ایک بے معنی سی بات ہے کہ) خدا انسان کی شہہ رگ سے بھی زیادہ انسان کے قریب ہے (16/ق) (جہاں تک مذہبی پیشوایت کا تعلق ہے تو) مومنو! اکثر علماء اور مشائخ لوگوں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں اور لوگوں کو خدا کے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں (کہ اگر خدا کی حکومت قائم ہوگئی تو انکی حکومت ختم ہو جائے گی) (35/التوبۃ)۔

حضورؐ نے فرمایا کہ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں بندے کے گمان سے بھی زیادہ بندے کے قریب ہوں (متفق علیہ) اللہ تعالی فرماتا ہے کہ جب میرا بندہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ اپنے دونوں ہونٹوں کو حرکت دیتا ہے (بخاری)

قرآن کی رو سے ملوکیت، سرمایہ پرستی اور مذہبی پیشوایت ایک ہی درخت کی تین شاخیں ہیں، ایک ہی نظام کے تین حصے ہیں۔ بقول علامہ اقبال

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام

....

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب

....

میں نے محکم کر دیا سرمایہ داری کا جنوں

....

صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہے تمام

یہی وہ استحصالی ٹولہ ہے جو محکوموں، کسانوں، مزدوروں غریبوں اور مریدوں کا خون چوس چوس کر عیش و آرام کی زندگی گزار رہا ہے۔ اسی استحصالی ٹولے کو قرآن ''مترفین'' (یعنی دوسروں کی کمائی پر عیش کرنے والے تن آسان و خوشحال لوگ) کے نام سے پکارتا ہے اور انسانیت کا بدترین دشمن قرار دیتا ہے کہ دعوت خداوندی (یعنی انسان کی حقیقی آزادی) کی مخالفت ہمیشہ مترفین نے ہی کی (34/سبا، 23/الزخرف) کیونکہ نظام خداوندی میں استحصالی ٹولے کیلئے کسی قسم کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

قرآن کہتا ہے کہ

اے وہ (محمدؐ) کہ جس کے ذمے (فرعونیت، قارونیت اور ہامانیت کا خاتمہ کر کے) دنیا کو سنوارنے اور (اسلاف پرستی اور روایت پرستی کا خاتمہ کر کے) ایک نیا جہاں پیدا کرنے کا فریضہ عاید ہے۔ اٹھ (کہ تیرے قیام میں ساری انسانیت کا قیام ہے) اور (ساری انسانیت کو

غلط روش کے غلط نتائج سے) آگاہ کر اور اس حقیقت کا اعلان کر دے کہ کبریائی صرف خدا کیلئے ہے (3-1/المدثر) اور جب خدا کا یہ بندہ (محمدؐ) دعوتِ خداوندی لے کر اٹھا تو مخالفین نے چاروں طرف سے حملہ کر کے اسے گھیر لیا (19/الجن) (لیکن نہ یہ مخالف نئے تھے نہ ہی انکی مخالفت نئی تھی کہ حق و باطل کا یہ معرکہ تو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا) خدا نے جب بھی کسی قوم کی طرف کوئی آگاہ کرنے والا (رسولؑ) بھیجا تو اس قوم کے مترفین (استحصالی ٹولے) نے کہا کہ جو دین تمھیں دیکر بھیجا گیا ہم اُسے نہیں مانتے (34/سبا، 23/الزخرف) اور یہ بھی کہا کہ ہمارے پاس بہت مال و دولت اور کثیر اولاد ہے (ہمارا ٹولہ مضبوط ہے) ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا (35/سبا)۔

(پہلے نبی نوحؑ کی دعوت کے جواب میں بھی یہی ہوا کہ) اس پر کفر کی روش اختیار کرنے والے قوم کے بڑے بڑے سرداروں (جنکے پاس مال و دولت کی فراوانی تھی) نے کہا کہ (اے نوحؑ) ہم تو دیکھتے ہیں کہ تم ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو (ہم کسی انسان کو رسول کیسے مان لیں) باقی رہے یہ لوگ جو تمھارے پیچھے چل رہے ہیں تو انکی حیثیت ہی کیا ہے؟ کہ یہ ہم میں ادنی درجے کے لوگ ہیں اور یہ صاف دکھائی دے رہا ہے کہ انہوں نے تمھارا مسلک سوچے سمجھے بغیر اختیار کیا ہے۔ ہمیں تو کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی کہ جس سے تمھیں ہمارے مقابلے میں کوئی برتری حاصل ہو۔ ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ تم اپنے

دعوے میں بالکل جھوٹے ہو(27/ھود)

(اور آخری نبی محمدؐ کیلئے بھی استحصالی ٹولے نے یہی کہا کہ) کیا ہم سب (بڑے بڑے سرداروں میں) اسی پر وحی اتری تھی؟ (8/ص)

یہ قرآن ان دونوں شہروں (مکہ اور طائف) میں سے کسی بڑے آدمی (یعنی صاحبِ دولت وثروت) پر کیوں نازل نہیں کیا گیا؟ (31/الزخزف)۔

استحصالی ٹولے کے پاس اپنے باطل نظام کا جواز صرف یہ ہوتا ہے کہ یہ نظام انکے اسلاف کے وقتوں سے چلا آ رہا ہے۔ آپ خود ہی سوچیے کہ بھلا یہ بھی کوئی جواز ہوا؟ دیکھا تو تو یہ جانا چاہیے کہ کیا یہ نظام قرآن کی روشنی میں درست ہے یا نہیں؟ لیکن استحصالی ٹولہ قرآن کی خالص تعلیم کو کب مانتا ہے؟

قرآن ہی کے بقول

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے (قرآن میں) نازل کیا ہے اسکی پیروی کرو تو یہ کہتے ہیں کہ ہم تو اس روش کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباواجداد کو چلتے ہوئے دیکھا ہے۔ یعنی خواہ انکے آباواجداد نہ عقل وبصیرت رکھتے ہوں نہ ہی وحی کے صحیح راستے پر گامزن ہوں یہ پھر بھی انہی کے نقشِ قدم پر چلیں گے (170/البقرۃ نیز دیکھیے 78/یونس، 62/ھود، 53/الانبیاء وغیرہ) کہتے ہیں کہ ہمارے لیے یہی کافی ہے کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اس روش پر چلتے دیکھا (104/المائدہ)

استحصالی ٹولے کا طریقہء واردات ہی ہوتا ہے کہ یہ پہلے لوگوں کے دلوں میں اسلاف کی عظمت و برتری راسخ کرتا ہے اور پھر اسلاف کی عظمت و برتری کا رکھوالا بن کر لوگوں سے اپنی ہر جائز و ناجائز بات منواتا رہتا ہے۔ استحصالی ٹولہ یہ تو کہہ نہیں سکتا کہ اگر قرآنی نظام رائج ہو گیا تو اس ٹولے کو بھی عام لوگوں کی طرح محنت مزدوری کر کے پیٹ پالنا پڑے گا، لہٰذا یہ کہہ کر لوگوں کو بھڑکاتا رہتا ہے کہ تمھیں تمھارے بزرگوں کی راہ سے گمراہ کیا جا رہا ہے۔ جو باتیں تمھیں بتائی جا رہی ہیں اگر صحیح ہوتیں تو کیا تمھارے بزرگوں کی نگاہ سے پوشیدہ رہ سکتی تھیں، تمھارے بزرگوں سے زیادہ باخبر اور سمجھدار کون ہو سکتا ہے؟

قرآن گواہ ہے کہ استحصالی ٹولے نے تمام انبیاء کرام کے بارے میں لوگوں سے یہی کہا کہ

یہ تمھیں تمھارے اسلاف کے راستے سے ہٹا رہے ہیں (62,87/ ہود، 78/یونس، 24/المومنون ،53/الانبیاء)

حضور اکرمؐ کے متعلق بھی تو یہی کہا گیا کہ

یہ شخص چاہتا ہے کہ جن چیزوں کو تمھارے باپ دادا پوجتے آئے تمھیں ان سے روک دے (43/سبا)

استحصالی ٹولہ لوگوں کو اپنے قابو میں رکھنے کیلئے ایک حربہ یہ بھی اختیار کرتا ہے کہ لوگوں کو فرقوں اور پارٹیوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اس سے استحصالی ٹولے کو ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ مختلف گروہوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف اتنی نفرت پیدا ہو جاتی ہے کہ ان میں کسی بات پر بھی اتفاق نہیں ہوتا۔ اور دوسرا یہ کہ مختلف گروہ ایک دوسرے کے ساتھ اتنا الجھ جاتے ہیں کہ انکے پاس استحصالی ٹولے کی دھاندلیوں پر توجہ دینے کا وقت ہی نہیں رہتا۔ بفرض محال اگر کوئی گروہ استحصالی ٹولے کے خلاف کھڑا ہو بھی جائے تو اس گروہ کی ضد میں

کوئی دوسرا گروہ استحصالی ٹولے کی حمایت پر اتر آتا ہے۔ قرآن میں لکھا ہے کہ فرعون نے بھی (قارون اور ہامان کی معاونت سے) ملک کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر رکھا تھا (4/القصص) تاکہ اسکی حکومت کو کسی قسم کا کوئی خطرہ نہ رہے۔

یاد رکھیے کہ دوسروں کی کمائی پر عیش اڑانے والے تن آسان لوگوں کو قرآن 'ظالم' قرار دیتا ہے (116/ھود) اسی لیے مترفین کو ظالم کہا گیا ہے (15-11/الانبیاء) اور یہ تو آپ جانتے ہی ہونگے کہ قرآن کی رو سے ظالم لوگ کسی قسم کی رعایت کے مستحق نہیں (37/ھود، 27/المومنون) اور ظالموں کیلئے خدا نے اَلم انگیز عذاب تیار کر رکھا ہے (22/ابراہیم ،42/الشوری) کہ ظلم کی سزا جہنم ہے (41/الاعراف، 29/الکھف)۔

قرآنِ کریم مطابق

> استحصالی ٹولے کا آخری ٹھکانہ جہنم ہے جہاں انکے لیے جھلسا دینے والی لُو، کھولتا ہوا پانی اور سیاہ دھوئیں کے سائے ہونگے۔ نہ انکے لیے ٹھنڈک ہوگی نہ عزت اور انکی یہ حالت اسلیے ہوگی کہ اس سے پہلے (یعنی دنیاوی زندگی میں) وہ عیش و آرام و تن آسانی کی زندگی بسر کرتے تھے (46-43/الواقعۃ)۔

یہ بات ایک لمحے کیلئے بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ نبی ءکریمؐ نے بذاتِ خود جو معاشرہ تشکیل دیا اس میں ملوکیت، سرمایہ پرستی اور مذہبی پیشوایت کا دور دور تک کہیں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ یہ بات بھی ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ ہر نبیؑ کی تعلیم کا خلاصہ ایک ایسے معاشرے کا قیام ہے جس میں کوئی انسان بھی کسی بھی دوسرے انسان کا استحصال نہ کر سکے (اسی لیے ہر نبی کی مخالفت استحصالی ٹولے نے ہی کی)۔ اور اس بات کو اپنے ایمان میں شامل کر لینا چاہیے کہ ساری دنیا کو فرعونیت، قارونیت اور ہامانیت سے پاک کرنا ہر انسان کا اولین فریضہ

ہے۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ آخری نبی رحمت عالم محمدؐ نے جو معاشرہ خود تشکیل دیا تھا اس میں ملوکیت، سرمایہ پرستی اور مذہبی پیشوایت کا دور دور تک کہیں کوئی سراغ نہیں ملتا؟

کاش ہم نبی ءکریمؐ پر اترنے والی وحی کو اپنے کردار میں جاری وساری کر کے اپنی فردوسِ گم گشتہ کا سراغ پا سکیں؟ کاش ہم ایک ایسے معاشرے کے قیام میں اپنا حصہ ڈال سکیں جہاں انسان کو انسان ہونے کی وجہ سے عزت کے قابل سمجھا جائے اور کسی انسان کو بھی اس کے حقوق سے محروم نہ کیا جا سکے؟ کاش ہمیں اپنے پروردگار کے ان احکام کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کی توفیق نصیب ہو جو علامہ اقبال کے بقول خدا نے کچھ اس طرح فرشتوں کو دیے کہ

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے درودیوار ہلا دو
سلطائی ءجمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقان کو میسر نہیں روٹی
اس کھیت کے ہر خوشہء گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سِلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو

کیا موت کا ایک وقت مقرر ہے؟

بیٹے کے قاتل کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کی دس سالہ جدوجہد نے شیخ صاحب کو کوڑی کوڑی کا محتاج کر دیا۔ وکیلوں کی فیسیں بھرتے بھرتے ان کا مکان تک فروخت ہو گیا۔ لیکن وہ اب بھی یہی فرماتے ہیں کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے جس سے پہلے انسان نہ خود مر سکتا ہے نہ کوئی اسے مار سکتا ہے اور جس کے بعد انسان نہ خود زندہ رہ سکتا ہے نہ کوئی اسے زندہ رکھ سکتا ہے۔

کوئی شیخ صاحب سے یہ پوچھے کہ اگر موت کا ایک وقت مقرر ہے تو کیا ان کے بیٹے کی موت کا ایک وقت مقرر نہیں تھا؟ پھر وہ بیٹے کے قاتل کو عدالتوں میں کیوں گھسیٹ رہے ہیں؟ کیا وہ اسے اس بات کی سزا دلوانا چاہتے ہیں کہ اس نے خدا کے مقرر کیے ہوئے وقت کو تبدیل کیوں نہیں کیا؟

شیخ صاحب کا عمل یوں بھی ان کے عقیدے کے خلاف ہے کہ اگر موت کا ایک وقت مقرر ہے تو ان کے بیٹے کے قاتل کی موت کا بھی تو ایک وقت مقرر ہو گا جس میں (شیخ صاحب ہی کے بقول) کمی بیشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تو پھر اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کی جدوجہد کا کیا مقصد؟ کیا وہ خدا کی لکھی ہوئی تقدیر کو مٹانا چاہتے ہیں؟

یہ بات تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اندھی تقلید کا عروج انسان کو عقلی زوال کی اس سطح پر لے آتا ہے کہ جہاں انسان اور حیوان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا بلکہ انسان حیوان سے بھی بدتر ہو جاتا ہے (44/الفرقان، 179/الاعراف)۔ اس مقام پر انسان بھی حیوان کی

طرح ہر کام لاشعوری طور پر کرتا ہے۔ چنانچہ شیخ صاحب لاشعوری طور پر اپنے عقیدے سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ ان کے بیٹے کو (اس کے قاتل نہیں بلکہ) اس کی تقدیر نے قتل کیا۔ لا شعوری طور پر اپنے عمل سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ ان کے بیٹے کو (اسکی تقدیر نے نہیں بلکہ) اس کے قاتل نے قتل کیا۔ اور لاشعوری طور پر ہی گزشتہ روز قرآن و حدیث سے یہ ثابت کر رہے تھے کے عقیدے اور عمل کے تفاد کو منافقت کہتے ہیں جو خدا کے نزدیک کفر سے بھی بری بات ہے۔

ایک شیخ صاحب ہی کیا اکثر لوگ ایک طرف تو پورے یقین کے ساتھ اس بات پر ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے لیکن دوسری طرف پورے خلوص کے ساتھ اس سے بچنے کے لئے بھی سرگرداں رہتے ہیں۔ عمدہ سے عمدہ ڈاکٹر سے استفادہ کیا جاتا ہے، اعلیٰ سے اعلیٰ دوا استعمال کی جاتی ہے، بڑے سے بڑے پیر کے آگے گڑگڑایا جاتا ہے، مشہور سے مشہور زیارت پر سجدے کیے جاتے ہیں، منتیں مانی جاتی ہیں، چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں، ختم پڑھائے جاتے ہیں، دعائیں کرائی جاتی ہیں۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ اگر موت کا وقت ٹل ہی نہیں سکتا تو اسے ٹالنے کی کوششوں کا کیا مقصد؟

آپ خود ہی سوچیے کہ

.... اگر موت کا ایک وقت مقرر ہوتا تو کیا قرآن اس حقیقت کا اعلان کر سکتا تھا کہ

تم میں سے کوئی وقت سے پہلے مر جاتا ہے اور کوئی عمر پوری کر کے (یعنی وقت پر) مرتا ہے (67/المومن)؟

.... اگر موت کا ایک وقت مقرر ہوتا تو کیا کتاب اللہ میں یہ لکھا ہو سکتا تھا کہ اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو (195/البقرۃ)؟

....اگر موت کا ایک وقت مقرر ہوتا تو

کیا خدا جنگ کے میدان میں جانے والے مجاہدین کو احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی تاکید کر سکتا تھا (71/النساء)؟ کیا اس سے اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ خدا کسی مجاہد کو اس گولی سے بچنے کی تلقین کرے جس پر خدا نے خود اس کا نام لکھا ہو یا نہ لکھا ہو؟

....اگر موت کا ایک وقت ہوتا تو کیا خدا یہ کہہ سکتا تھا کہ

جس انسان نے کسی ایک انسان کو بھی ماسوائے اس کے قتل کیا کہ اسے خون یا بغاوت کے جرم میں سزائے موت دی گئی ہو تو یوں سمجھو کہ اس نے تمام نوع انسانی کو قتل کر دیا اور جس نے کسی ایک انسان کی بھی جان بچائی تو یوں سمجھو کہ اس نے تمام نوع انسانی کی جان بچائی (32/المائدہ)؟ کیا یہ مانا جا سکتا ہے کہ خدا کسی انسان کو کسی دوسرے انسان کی جان لینے یا اس کی جان بچانے کا اختیار دیے بغیر ہی اسے یہ اختیار جائز طور پر استعمال کرنے کی ہدایت کرے؟

....اگر موت کا ایک وقت مقرر ہوتا

تو کیا خدا قتل کی سزا مقرر کر سکتا تھا؟ وہ بھی غلطی سے ہو جانے والے قتل کی علیحدہ اور جان بوجھ کر کیے جانے والے قتل کی علیحدہ (92,93/النساء)؟ کیا یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ خدا کسی کے قتل کا فیصلہ خود کر کے اس کا ذمہ دار کسی دوسرے کو ٹھہرائے؟

....اگر موت کا ایک دن مقرر ہوتا تو کیا حضور اکرمؐ یہ فرما سکتے تھے کہ ''نیکی عمر کو لمبا کرتی'' ہے (ترمذی) ''جو شخص چاہے کہ اس کی عمر لمبی

ہو جائے تو اسے چاہیے کہ وہ لوگوں کے ساتھ صلہ رحمی کرے''

(بخاری، مسلم)

غور کیجئے کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ موت کا ایک دن مقرر ہے تو قرآن میں کتنا تضاد پیدا ہو جاتا ہے اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ قرآن کے اپنے بقول اگر قرآن خدا کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں تضاد پایا جاتا (82/النساء)؟

تو آپ خود ہی سوچیے کہ جو شیخ صاحب تسلیم کرتے ہیں، کیا وہ یہ ماننے کے مترادف نہیں کہ (معاذ اللہ) قرآن خدا کی کتاب ہی نہیں؟

شیخ صاحب سمجھتے ہیں کہ قرآن میں جگہ جگہ جو یہ لکھا ہے کہ ''خدا ہی زندگی دیتا ہے اور خدا ہی موت دیتا ہے'' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا بذاتِ خود ہر زندہ ہونے والے کو زندہ کرتا ہے اور بذاتِ خود ہر مرنے والے کو مارتا ہے؟

کاش شیخ صاحب کو معلوم ہوتا کہ قرآن کے بقول

قرآن نازل ہی اس لیے کیا گیا کہ لوگ عقل وفکر سے کام لے سکیں (29/ص، 3/الزخرف) قرآن نازل ہی اہلِ عقل وفکر کے لیے کیا گیا (3/حم السجدۃ، 52/ابراہیم)

تو شیخ صاحب کو یہ قرآنی دعوت دی جاتی کہ

عقل وفکر سے کام لیا کرو (44/البقرۃ، 65/ال عمران، 32/ الانعام، 169/الاعراف، 16/یونس، 51/ہود، 109/ یوسف وغیرہ) اور قرآن پر غور وفکر کیا کرو (82/النساء)

اور ان سے یہ گزارش کی جاتی کہ قرآن میں غزوہ بدر کے بارے میں جو یہ لکھا ہے کہ

(اے اہل ایمان!) تم نے کافروں کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے قتل کیا۔اس وقت تم نے ان پر تیر نہیں چلائے تھے بلکہ خدا نے چلائے تھے(17/الانفال)

تو کیا جنگ بدر میں خدا نے بذات خود کفار کو قتل کیا تھا یا بذات خود ان پر تیر چلائے تھے؟ اور بیعت رضوان کے بارے میں جو یہ لکھا ہے کہ

(اے محمدؐ) جو لوگ تجھ سے معاہدہ استوار کرتے ہیں ان کے ہاتھوں پر (تیرا نہیں بلکہ) خدا کا ہاتھ ہوتا ہے(10/الفتح)

تو کیا بیعت رضوان میں حضور اکرمؐ سے بیعت کرنے والوں کے ہاتھوں پر خدا نے فی الواقعہ اپنا ہاتھ رکھا تھا؟

آپ خود ہی فرمایئے کہ اگر خدا کے ہاتھوں کفار کا قتل ہونا فی الواقعہ خدا کے ہاتھوں کفار کا قتل ہونا نہیں؟ اگر خدا کے تیر چلانے کا مطلب فی الواقعہ خدا کا تیر چلانا نہیں؟ اور اگر خدا کے ہاتھ کا مطلب فی الواقعہ خدا کا ہاتھ نہیں؟ تو پھر خدا کے زندگی یا موت دینے کا مطلب فی الواقعہ خدا کا زندگی یا موت دینا کیسے ہوسکتا ہے؟

یہ نہایت اہم نکتہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ قرآن ہر اس چیز کو براہ راست خدا سے منسوب کر دیتا ہے جو قانون خداوندی کی رو سے رونما ہوتی ہے۔مثال کے طور پر قرآن میں آتا ہے کہ

خدا نے انسان کو قلم سے لکھنا سکھایا(4/العلق،282/البقرۃ)

کیونکہ خدا کا قانون یہ ہے کہ اگر انسان کو ایک خاص ماحول میسر آجائے تو وہ لکھنا سیکھ لیتا ہے، ورنہ کیا اس آیت کا مطلب یہ لیا جاسکتا ہے کہ خدا نے اپنے ہاتھ سے انسان کو قلم پکڑوا کر لکھنا سکھایا؟ ظاہر ہے کہ ایسا سوچا بھی نہیں جاسکتا۔اس آیت کا درست مفہوم یہ

ہوگا کہ

خدا کے قانون نے انسان کو قلم سے لکھنا سکھایا

اور جب یہ کہا گیا کہ اے اہل ایمان! تم نے کافروں کو.... (17/الانفال) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ

(اے اہل ایمان!) تم نے کافروں کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا (کے قانون) نے قتل کیا۔ اس وقت تم نے ان پر تیر نہیں چلائے بلکہ خدا (کے قانون) نے چلائے۔

اور جب یہ کہا گیا کہ ''اے محمد! جو لوگ تجھ سے.... (10/الفتح) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ

''اے محمد! جو لوگ تجھ سے معاہدہ استوار کرتے ہیں وہ تجھ سے نہیں بلکہ خدا (کے قانون) سے معاہدہ استوار کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں پر خدا (کے قانون) کا ہاتھ ہوتا ہے''۔

اسی طرح جب یہ کہا گیا کہ

''خدا ہی زندگی دیتا ہے اور خدا ہی موت دیتا ہے''

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ

''خدا کا قانون ہی زندگی دیتا ہے اور خدا کا قانون ہی موت دیتا ہے''

یہی ہے وہ نکتہ جسے سمجھ لینے سے وہ تضادات دم توڑ دیتے ہیں جو عمومی نگاہ سے دیکھنے پر قرآن کریم کے گرد لپٹے دکھائی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ تضاد کہ خدا ایک طرف تو خود ہی یہ کہتا ہے کہ خدا کے علاوہ نہ کوئی کسی کی جان لے سکتا ہے اور نہ کوئی کسی کی جان بچا سکتا ہے۔ لیکن دوسری طرف خود ہی یہ بھی کہتا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کی

جان لے بھی سکتا ہے اور اس کی جان بچا بھی سکتا ہے (32/المائدۃ)۔ درست مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے قانون کی رو سے ایک انسان دوسرے انسان کی جان لے بھی سکتا ہے اور بچا بھی سکتا ہے۔

یہ ثابت کرنے کے لیے کہ موت کا ایک دن مقرر ہے، عام طور پر یہ آیات پیش کی جاتی ہیں کہ

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلً (145/ال عمران)

وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ (11/فاطر)

اور ان کا ترجمہ کچھ اس طرح کیا جاتا ہے کہ

''کسی شخص کو خدا کے حکم (اذن) کے بغیر موت نہیں آسکتی یہ ایک ایسی اجل ہے جو لکھی ہوئی ہے''

''نہ کسی بڑی عمر والے کو عمر زیادہ دی جاتی ہے نہ اس کی عمر کم کی جاتی ہے مگر یہ (سب کچھ) کتاب میں (لکھا) ہے''

یہ مفاہیم درست معلوم نہیں ہوتے کیونکہ لغت کی رو سے

کتاب کے معنی فیصلہ اور حکم کے بھی آتے ہیں (تاج العروس)۔

قرآن کریم میں 'کتب علیکمُ القصاص' تم پر قصاص پر کیا گیا (178/البقرۃ) یا 'کتب علیکم الصیام' تم پر روزہ فرض کیا گیا (183/البقرۃ) فرض اور ضروری قرار دینے کے معنوں میں آیا ہے۔ یعنی جو کام قانوناً لازم قرار دیا جائے (اسی لئے مجموعہ قوانین کو

کتاب کہا جاتا ہے)۔ابن فارس نیز لطائف اللغۃ نے بھی 'الکتاب' کے معنی 'الفرض' اور 'الحکم' لکھے ہیں۔لہذا جب قرآن کریم کو کتاب کہا گیا ہے تو اس کے معنی ضابطہ قوانین کے ہیں کیونکہ اس میں گوناں گوں احکام واوامر جمع ہوتے ہیں''۔

اوراذن اللہ کے معنی ہوئے 'اللہ کا علم اور مشیت' (راغب)۔لہٰذا قرآن کریم میں جہاں اذن اللہ آئے گا اس کے معنی سیاق وسباق کے اعتبار سے خدا کے قانون کے ہونگے۔جس میں اس کا علم اور مشیت دونوں آجاتے ہیں۔مثال کے طور پر سورۃ الاعراف میں ہے کہ ''اور اچھی زمین سے اس کی پیداوار خدا کے اذن (قانون) کے مطابق نکلتی ہے'' (58/الاعراف)۔ظاہر ہے کہ زراعت کے متعلق خدا نے ایک قانون مقرر کر دیا ہے اور فصلیں اس قانون کے مطابق پیدا ہوتی ہیں۔اسی طرح سورہ 'الحج' میں ہے کہ ''وہ بادلوں (بارش) کو تھامے رکھتا ہے کہ اس کے اذن کے بغیر زمین پر نہ گرے''۔یہاں بھی اذن سے مراد قانونِ خداوندی ہے جس کے مطابق مینہ برستا ہے۔

چنانچہ زیر بحث پہلی آیت کا درست مفہوم یہ ہوگا کہ

''کسی شخص کو قانون خداوندی کے خلاف موت نہیں آسکتی کہ انسان کی عمر (اجل) کا تعین قانون خداوندی کی رو سے ہوتا ہے۔

اور دوسری کا یہ ہوگا کہ

عمر کا بڑھنا اور گھٹنا خدا کے (طبیعی) قانون کے مطابق ہوتا ہے۔

آسان لفظوں میں یوں کہیے کہ کوئی شخص دودھ پینے سے ہلاک نہیں ہوسکتا کیونکہ خدا کا قانون یہ ہے کہ دودھ پینے سے ہلاکت واقع نہیں ہوسکتی۔ یا یوں کہیے کہ کوئی شخص زہر کے زیرِ اثر موت سے نہیں بچ سکتا کیونکہ کہ قانون خداوندی کے تحت زہر کے اثر سے موت واقع ہوجاتی ہے۔

یہ بات ہمیشہ یاد رکھیے کہ جس طرح ہر مشینری اپنے موجد کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت چلتی بھی ہے اور رکتی بھی ہے۔ اسی طرح انسانی جسم کی مشینری بھی اپنے موجد (خدائے بزرگ و برتر) کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت چلتی بھی ہے اور رکتی بھی ہے۔ (اس مشینری کے چلنے کا نام زندگی اور رکنے کا نام موت ہے)۔ اور جس طرح ہر مشینری کی ایک مخصوص عمر ہوتی ہے جو حفاظتی اقدامات سے بڑھ جاتی ہے اور غیر حفاظتی اقدامات سے گھٹ جاتی ہے۔ اسی طرح انسانی جسم کی بھی ایک خاص عمر ہوتی ہے جسے حفاظتی اقدامات سے بڑھایا بھی جاسکتا ہے اور غیر حفاظتی اقدامات سے گھٹایا بھی جاسکتا ہے۔

کیا آپ نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ اگر گاڑی کے انجن کی حفاظت اس کے موجد کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت کی جائے یعنی اس کا مخصوص تیل ایک مخصوص تواتر سے تبدیل کیا جاتا رہے، جو پرزہ خراب ہو فوراً تبدیل کروا دیا جائے، سروس میں کسی قسم کی کوتاہی سے بچا جائے وغیرہ وغیرہ تو اس کی عمر بڑھ جاتی ہے لیکن اگر ایسا نہ کیا جائے تو اس کی عمر گھٹ جاتی ہے اور اگر اس میں انجن کے تیل کی جگہ ناریل یا سرسوں کا تیل ڈال دیا جائے تو آپ خود ہی سوچیے کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ اسی طرح اگر انسانی جسم کا خیال حفظان صحت کے اصولوں کے تحت رکھا جائے تو اس کی عمر بھی بڑھ جاتی ہے۔ بصورت دیگر اس کی عمر بھی گھٹ جاتی ہے۔

کیا آپ نے کبھی اس بات پر بھی توجہ نہیں دی کہ جن ممالک میں حفظان صحت

کے اصولوں کی پابندی اور جان لیوا حادثات کی روک تھام نسبتاً بہتر ہے وہاں کے باشندوں کی اوسط عمر بھی نسبتاً لمبی ہے۔ مثلاً چینیوں کی اوسط عمر پاکستانیوں کی اوسط عمر سے پندرہ یا بیس سال زیادہ ہے۔

حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ نیکی عمر کو لمبا کرتی ہے (ترمذی)۔ نیکی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک جسمانی اور ایک روحانی۔ جسمانی نیکی سے مراد وہ اچھے کام (حفظانِ صحت کے اصول) ہیں جن سے جسم میں تعمیر و ترقی پیدا ہوتی ہے اور روحانی نیکی سے مراد وہ اچھے کام ہیں جن سے روح میں تعمیر و ترقی پیدا ہوتی ہے۔ جسمانی نیکی جسمانی تناؤ اور تکلیف سے بچاتی ہے جبکہ روحانی نیکی روحانی تناؤ اور تکلیف سے۔

جسمانی نیکی سے عمر بڑھنے کی بات تو ہو چکی لیکن روحانی نیکی سے عمر یوں بڑھتی ہے کہ اس سے انسان کو اطمینانِ قلب نصیب ہوتا ہے یعنی وہ نفسیاتی الجھنوں سے محفوظ رہتا ہے۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ علمِ طب کی رو سے نفسیاتی الجھنیں انسان کے اعضا کو طرح طرح کی بیماریوں (السر، بلڈ پریشر وغیرہ) میں مبتلا کر دیتی ہیں جن سے انسان کی عمر گھٹ جاتی ہے۔ بصورتِ دیگر انسان کی عمر بڑھ جاتی ہے۔

اسی لیے حضورؐ نے یہ فرمایا کہ جو شخص یہ چاہے کہ اس کی عمر لمبی ہو جائے تو اسے چاہیے کہ وہ لوگوں کے ساتھ صلہ رحمی کرے (بخاری، مسلم)

لیکن انسان کی عمر چاہے کتنی ہی لمبی کیوں نہ ہو جائے آخر کار اسے ختم ہونا ہے کہ انسان چاہے کتنے ہی مضبوط قلعے کے اندر بھی کیوں نہ چھپ جائے اسے وہاں بھی موت آ جائے گی (78/النساء) (ہمیشگی ماسوائے خدا کے کسی کو حاصل نہیں اور) ہر ذی روح کو (ایک نہ ایک دن) موت کا ذائقہ چکھنا ہے (185/ال عمران)

آپ نے دیکھا کہ قرآن پر ذرا سی فکر و تحقیق سے یہ بات کتنی واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کی موت خدا کے بنائے ہوئے قانونِ طبیعی کے مطابق ہوتی ہے۔ اور اس قانون کا علم خدا نے انسان کو دے دیا ہے۔ اب انسان کا جی چاہے تو اس علم کو بروئے کار لائے اور اپنا خیال رکھ کر اپنی عمر لمبی کر لے یا بداحتیاطی سے اپنی عمر گھٹا لے۔ یا خودکشی کر کے فوراً ہی مر جائے۔ لیکن جب خدائے بزرگ و برتر کے اس قانون کی رو سے کسی کی عمر کے خاتمے کی گھڑی آ جائے تو پھر اس کی موت کے وقت میں کمی بیشی ممکن نہیں ہوتی (11/المنفقون)

اسی لیے تو قرآنِ کریم میں آیا ہے کہ تم میں سے کوئی وقت سے پہلے مر جاتا ہے اور کوئی عمر پوری کر کے (یعنی وقت پر) مرتا ہے (67/11المومن)

اور حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ لوگ ہلاک نہیں کیے جائیں گے یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو معذور بنا لیں (ابوداؤد)

شیخ صاحب کی سمجھ میں تو شاید اب بھی یہ بات نہ آئی ہو لیکن آپ کو تو سمجھ آ جانا چاہیے کہ قرآن کی رو سے موت تو مقرر ہے لیکن موت کا ایک وقت مقرر نہیں۔

ایک عظیم القدر معجزہ

حیوان سے اس کی زندگی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ حیوان کو صاحب اختیار و ارادہ نہیں بنایا گیا اور وہ (اپنی جبلت کے ہاتھوں) ایک خاص روش کی پیروی پر مجبور ہے (49,50 / النحل)۔ لیکن انسان سے یہ ضرور پوچھا جائے گا کہ اس نے اپنی زندگی میں جو کچھ کیا وہ کیوں کیا؟ اس لیے کہ انسان کو صاحب اختیار و ارادہ بنایا گیا اور وہ کسی خاص روش کی پیروی پر مجبور نہیں (29 / الکھف)۔

حیوان کو چونکہ صاحب اختیار و ارادہ نہیں بنایا گیا لہذا اسے عقل بھی نہیں دی گئی کہ عقل کی ضرورت تو اسے ہوتی ہے جسے اپنے فیصلے خود کرنے ہوں یعنی جسے ایک سے زیادہ راستوں میں سے کوئی ایک راستہ اپنانے کی آزادی حاصل ہو۔ لیکن انسان کو صاحب اختیار و ارادہ بنایا گیا لہذا اسے عقل بھی دی گئی تا کہ وہ اپنے فیصلے سوچ سمجھ کر کرے اور اپنے فیصلوں کے لیے بجا طور پر ذمہ دار ٹھہرایا جا سکے۔

قرآن کے بقول

> ''خدا نے انسان کو دیکھنے سننے (یعنی سوچنے سمجھنے) کی صلاحیت (یعنی عقل) عطا کی اور (قرآن کے ذریعے) درست راستہ دکھا دیا۔ اب انسان کا جی چاہے تو وہ اس راستے کو اختیار کر لے اور جی چاہے تو اس سے انکار کر دے'' (2,3 / الدھر)

سیدھی سی بات ہے کہ انسان کو کیونکہ اپنی مرضی کے راستے پر چلنے کی آزادی دی

گئی لہذا اسے اس جانچ پڑتال کی صلاحیت بھی دے دی گئی کہ کونسا راستہ درست ہے اور کون سا غلط۔ یا یوں کہیے کہ انسان کو عقل اس لیے دی گئی کہ وہ اپنے اختیار و ارادہ کو صحیح معنوں میں استعمال کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن ایسے انسانوں کو ''حیوان بلکہ حیوان سے بھی بدتر'' قرار دیتا جو عقل سے کام نہیں لیتے ہیں (44/الفرقان، 179/الاعراف) اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کی رو سے ایمان ان ہوتا ہی وہی ہے جو سوچ سمجھ کر لایا جائے۔ چنانچہ حضور اکرمؐ نے ہمیشہ دلائل کی بنیاد پر خدا کی طرف دعوت دی۔

یاد کیجئے کہ حضور اکرمؐ نے صفا کی پہاڑی پر کھڑے ہو کر مکہ کے لوگوں سے کہا تھا کہ

> اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے دامن سے ایک فوج نکلا چاہتی ہے تو کیا تم میری بات کو سچ مانو گے (بخاری)

اور مکہ کے لوگوں نے جواب دیا تھا کہ ہم آپؐ کی بات کو ضرور سچ مانیں گے کیونکہ آپؐ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ چنانچہ حضور اکرمؐ نے اس دلیل کے ساتھ دعوت حق کا آغاز کیا کہ اگر میں نے آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا تو آج کس لیے جھوٹ بولوں گا؟ اور پھر فرمایا تھا کہ خدائے بزرگ و برتر نے مجھے رسالت کیلئے منتخب کر لیا ہے اور کہا ہے کہ

> میں تمھیں (دلائل کے رو سے تمھاری غلط روش کے تباہ کن نتائج سے) آگاہ کر دوں (92/الانعام، 7/الشوری) (کہ تم لوگ زندگی کے جس راستے پر چل رہے ہو وہ ظلم کا راستہ ہے جو سیدھا بربادی و ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے۔ اگر تمھیں میری بات کا یقین نہیں تو تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھ لو کہ) کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں خدا

(کے قانون) نے ہلاک کر دیا (کیونکہ) وہ ظلم کرنے والی تھیں۔ وہ ایسی اجڑیں کہ اپنی چھتوں پر گر کر رہ گئیں۔ کنویں ناکارہ ہو گئے۔ سر بفلک محل کھنڈر بن گئے (45/الحج) (ظلم کی روش نے انہیں تباہ کر دیا اور ظلم کی روش تمھیں بھی تباہ کر دے گی کہ) خدا کا (اٹل) قانون ان لوگوں کیلئے بھی یہی رہا جو گزر گئے ہیں (اور باقی لوگوں کیلئے بھی یہی رہے گا کہ) تم خدا کے قانون میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے (62/الاحزاب)

لیکن یہ سیدھی سی بات بھی ٹیڑھی عقل والوں کی سمجھ میں نہ آئی اور وہ کہنے لگے کہ (اگر محمدؐ سچ کہتا ہے تو) ایسا کیوں نہیں ہوا کہ اس پر اس کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی اترتی؟ (27/الرعد)

غور کیجئے کہ یہ تو ایسے ہی ہوا کہ کوئی ایک شخص کسی دوسرے شخص سے یہ کہے کہ تم اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہے ہو۔ تمہارا پاؤں کٹ جائے گا۔ کیونکہ جو کوئی بھی اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارتا ہے اس کا پاؤں کٹ جاتا ہے۔ وہ دیکھو فلاں شخص کا پاؤں کٹا ہوا ہے اس نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی؟

اور دوسرا شخص اس دلائل آور نصیحت کے جواب میں پہلے شخص سے یہ کہے کہ اگر تم اپنی انگلی کے اشارے سے کسی پہاڑ کو ہوا میں اڑا دو یا اپنے ہونٹوں کی جنبش سے پانی میں آگ لگا دو تو میں یہ مان لوں گا کہ پاؤں پر کلہاڑی مارنے سے پاؤں کٹ جاتا ہے۔ لیکن اگر تم مجھے اس قسم کا معجزہ نہیں دکھاؤ گے تو میں اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے سے باز

نہیں آؤں گا۔

یا کوئی ڈاکٹر کسی مریض سے کہے کہ

تمھیں انفیکشن (Infaction) ہو چکی ہے لہذا تم فوراً نسخے میں لکھی اینٹی بائیاٹک (Antibiotic) کا کورس کرو۔

اور مریض جواب دے کہ

ڈاکٹر صاحب اگر آپ ایک اشارے سے اپنے کلینک میں پھلوں کا باغ اگا دیں تو ہی میں اپنی بیماری کو تسلیم کر کے اپنا علاج کراؤں گا۔

آپ خود ہی فرمائیے کہ اس سے بڑی حماقت اور کیا ہو سکتی ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ (یہ منکرینِ دعوت بجائے اس کے کہ قرآن پر غور و فکر کریں اور علم و بصیرت کی رو سے اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔ اے محمدؐ تم سے) کہتے ہیں کہ ہم اس وقت تک تیری بات ماننے کے لئے تیار نہیں جب تک تو ہمیں اس قسم کی نشانیاں نہ دکھا دے۔ مثلاً تو ایک اشارہ کرے اور زمین میں سے ایک چشمہ پھوٹ بہے۔ یا تیرے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو اور تیرے حکم سے اس میں پانی کی ندیاں جاری ہو جائیں۔ یا جیسا تو ہمیں خدا کے عذاب سے ڈراتا ہے تو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دے۔ یا تو خود خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لا کھڑا کر دے۔ یا تیرے لیے سونے کا ایک محل تعمیر ہو جائے۔ یا تو (ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے) آسمان پر چڑھ جائے۔ اور صرف آسمان پر چڑھ ہی نہ جائے۔ کیونکہ محض اتنی سی بات سے ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ بلکہ آسمان سے ایک لکھی

لکھائی کتاب ہم پر اتار دے جسے ہم پڑھ کر دیکھ لیں (کہ اسے واقعی خدا نے خود لکھا ہے)۔ اے پیغمبر ان سے کہو کہ میرا پروردگار اس سے بہت بلند ہے (کہ تمہارے ایمان کیلئے اس قسم کی طفلانہ باتیں کر کے دکھائے۔ رہا سوال میرا۔ تو میں یہ سب کچھ کس طرح کر سکتا ہوں کہ) میں اس فرق کے ساتھ کہ مجھ پر وحی اترتی ہے تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں (90-93/ بنی اسرائیل)

اور (دیکھو) اگر ایسا ہو سکتا کہ کسی قرآن سے پہاڑ چلنے لگتے یا زمین پھٹ جاتی یا مردے بول اٹھتے تو (وہ اسی قرآن سے ہو سکتا تھا کہ) سب اختیار خدا ہی کے پاس ہے۔ پھر جو لوگ ایمان لائے کیا انہیں معلوم نہیں کہ (اگر خدا زبردستی اپنی بات منوانا چاہتا تو اس کے لیے معجزات دکھانے کی بھی کیا ضرورت تھی کہ) اگر خدا چاہتا تو سب لوگوں کو (پیدائشی طور پر ہی) ہدایت کے راستے پر چلا دیتا (31/الرعد)

اے محمدؐ! اگر تمہیں یہ بات گراں گزرتی ہے کہ یہ (دل کے اندھے) لوگ صحیح راستے کی طرف کیوں نہیں آتے تو (تم سوچتے ہو کہ) اگر تم ایسا کر سکو کہ زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈ نکالو (اور پاتال تک جا پہنچو) یا آسماں میں کوئی ٹیڑھی لگا لو (اور عالم بالا تک چلے جاؤ) اور وہاں سے ان کے لیے کوئی نشانی لے آؤ (جس سے مرعوب و مجبور ہو کر یہ لوگ ایمان لے آئیں۔ تو خدا کو اندھے اور غیر شعوری ایمان کی ضرورت نہیں۔ ورنہ خدا کیلئے کیا مشکل تھا کہ) اگر خدا چاہتا تو

سب انسانوں کو (حیوانوں کی طرح مجبورِ محض' بنا کر) ہدایت کے راستے پر چلا دیتا۔تم (انکے مطالبے پر توجہ دے کر) نادان مت بننا (35/الانعام)

ہم چاہیں تو (ہمارے لیے کیا مشکل ہے؟ ہم) آسمان سے ایسی نشانی نازل کر سکتے ہیں کہ انکی گردنیں اس کے سامنے جھک جائیں (4/الشعرا)

(لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا کیونکہ) اے نبیؐ! اگر خدا کو ایسے ایمان کی ضرورت ہوتی تو سوچے سمجھے بغیر لایا جائے تو اس کے لئے عجائب آفرینیوں کے تکلف کی بھی کیا حاجت تھی کہ اگر تمھارا خدا چاہتا تو جتنے لوگ زمین پر ہیں سب کے سب (پیدا ہی اسطرح کیے جاتے کہ) ایمان لے آتے۔تو کیا تم لوگوں کو زبردستی مومن بنانا چاہتے ہو جبکہ (خدا کی مرضی یہ ہے کہ لوگ علم وبصیرت کی رو سے ایمان لائیں۔ لہذا) دستور خداوندی کے مطابق ان لوگوں پر حقیقت واضح ہی نہیں ہوسکتی جو عقل وفکر سے کام نہیں لیتے (وہ الجھاؤ میں مبتلا رہتے ہیں) (99,100/یونس)

ان (کٹ حجتی کرنے والوں) کا اعتراض یہ ہے کہ نبیؐ پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی؟ اے نبیؐ! ان سے کہو کہ نشانی اتارنا خدا کے لیے کچھ مشکل نہیں۔لیکن اکثر لوگ نادانی میں مبتلا ہیں اور (انہیں اس حقیقت کا ادراک نہیں کہ خدا ان کی عقل مفلوج و ماؤف کر کے ان سے حقیقت نہیں منوانا چاہتا، بلکہ یہ

چاہتا ہے کہ انسان فکر و تدبر کی روشنی میں صحیح و غلط میں امتیاز کرے۔ ورنہ اگر خدا زبردستی اپنی اطاعت کروانا چاہتا تو اپنے اردگرد) زمین میں چلتے ہوئے کسی جانور یا آسمان میں اُڑتے ہوئے کسی پرندے کو دیکھ لو۔ وہ سب (طبیعی اعتبار سے) تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں (لیکن تمہارے برعکس) ان کی تقدیر کے نوشتے میں خدا نے کوئی کسر نہیں چھوڑی (یعنی انہوں نے اپنی زندگی میں جو کچھ کرنا ہے وہ سب خدا نے پہلے سے ہی لکھ دیا ہے) چنانچہ وہ سب (طوعاً و کرعاً) اپنے رب کی ہدیت کے گرد جمع ہیں (اگر انہیں ایسا بنایا گیا تو کیا انسان کو ایسا نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ لیکن انسان کو صاحب اختیار و ارادہ بنایا گیا اور عقل دی گئی تا کہ وہ اپنی تقدیر خود لکھے۔ اور اس طرح علم و آگہی کے اجالوں میں رہے چنانچہ) جو لوگ خدا کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں (اور غور و فکر سے کام نہیں لیتے) وہ بہرے اور گونگے بن کر (جہالت اور تعصب کے) اندھیروں میں کھو جاتے ہیں

(الانعام / 37-39)

اے محمدؐ! ان سے کہو کہ (مجھ سے عجائب آفرینیوں کی توقع فضول ہے کہ) میری راہ تو یہ ہے کہ میں بصیرت کی بنیاد پر خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں اور میرے نقش قدم پر چلنے والے لوگ بھی بصیرت کی بنیاد پر ہی خدا کی طرف دعوت دیں گے (یوسف / 108) (سو اگر تمہیں میری دعوت سے اختلاف ہے تو مجھ سے معجزات کا مطالبہ کرنے کے بجائے) اپنے دعوے کی تائید میں کوئی دلیل پیش کرو (111 /

البقرۃ،24/الانبیاء،64/النمل)

اے رسولؐ! ان سے کہو کہ کامل اور پکی دلیل ایک ہی ہے اور وہ ہے (قرآن یعنی) وحی ءالٰہی کی دلیل (149/الانعام) (اے محمدؐ! ان سے کہو کے قرآن عجائب آفرینیوں کے لئے نازل نہیں کیا گیا کہ قرآن کی صورت میں) تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح دلائل آئے ہیں (175/النساء) (اور یہ واضح دلائل اس لیے آئے ہیں کہ) تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ کھلی دلیل کے ساتھ ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ کھلی دلیل کے ساتھ زندہ رہے (42/الانفال)

(بات یہ ہے کہ خدا انہیں عقل وفکر کی روشنی میں دلیل و برہان کے راستے حقیقت کی منزل تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اور دلیل و برہان سے خالی معجزات سے عقل وفکر مفلوج و ماؤف ہوکر رہ جاتی ہے۔ اگر انہیں معجزات دیکھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو یہ لوگ علم وبصیرت پر مبنی معجزات کیوں نہیں دیکھتے جو ان معجزات سے کہیں زیادہ بڑے ہیں جن کا مطالبہ یہ لوگ کرتے ہیں۔ اے نبیؐ! ان سے پوچھو کہ) کیا تم قرآن پر غور وفکر نہیں کرتے یا تمہارے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں (24/محمدؐ) (کیا قرآن سے بڑا معجزہ بھی کوئی ہوسکتا ہے) جن جن ہستیوں اور قوتوں کو اپنی مدد کیلئے بلا سکتے ہو بلا لو اور قرآن جیسی ایک سورت ہی بنا کر دکھا دو (23/البقرۃ، 38/یونس، 13/ہود وغیرہ)

(اے رسولؐ! ان سے پوچھو کہ) کیا تم عقل نہیں رکھتے (65/ال عمران) کہ عقل والوں کیلئے تو نظام فطرت میں (قدم قدم پر خدا کی) نشانیاں ہیں (13,5/الجاثیۃ، 3/الرعد، 21/الزمر، 86/النمل، 54/طہ، 42-33/یس، 190/ال عمران وغیرہ وغیرہ)

ان سے کہو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھو (101/یونس)

آسمانوں اور زمین میں (خدا کی قدرت وحکمت کی) کتنی ہی نشانیاں ہیں جن سے یہ لوگ آنکھیں بند کر کے گزر جاتے ہیں

(105/یوسف)

(ان سے پوچھو کہ کیا تم نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ) خدا نے (کس طرح) تمہارے لیے (گول) زمین کو بچھونے کی طرح بچھا دیا اور نقل وحرکت کیلئے اس میں راہیں نکال دی.... اس بات میں عقل والوں کیلئے کیسی کھلی نشانیاں ہیں (53,54/طہ)

اور بارش جسے خدا آسمان سے برساتا ہے اور اس سے زمین مرنے کے بعد جی اٹھتی ہے (164/البقرۃ) اسی پانی سے خدا تمہارے لیے کھیتیاں اگاتا ہے اور زیتوں، کھجور، انگور اور ہر طرح کے پھل پیدا کرتا ہے۔ یقیناً اس بات میں غور کرنے والوں کیلئے ایک بہت بڑی نشانی ہے (11/النحل)

(کیا تم نے کبھی اس بات پر بھی توجہ نہیں دی کہ) سب درختوں کو ایک ہی پانی سیراب کرتا ہے لیکن (انکے پھل مختلف ہوتے ہیں اور) ہم

بعض پھلوں کو بعض پر برتری دیتے ہیں۔ یقیناً اس بات میں ان لوگوں کیلئے بڑی ہی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں (4/الرعد)

(کیا تم نے کبھی اس بارے میں بھی نہیں سوچا کہ خدا کی قدرت و حکمت سے کس طرح) مویشیوں کے پیٹ میں جو گوبر اور خون ہے اس سے تمہارے لیے خالص اور خوشگوار دودھ تیار ہوتا ہے جسے تم پیتے ہو .... اس بات میں عقل والوں کیلئے کتنی بڑی نشانی ہے (66,67/النحل)

خدا کی نشانیوں میں سے ایک (نشانی) یہ بھی ہے کہ اس نے تمہاری تخلیق (کی ابتدا) مٹی سے کی۔ پھر تم (اس قابل ہو گئے کہ گوشت پوشت کے) آدمی بن کر چلتے پھرتے (نظر آتے) ہو.... اس میں ان لوگوں کیلئے (بہت بڑی بڑی) نشانیاں ہیں جو غور وفکر سے کام لیتے ہیں (20,21/الروم)

(ان سے کہو کہ غور سے دیکھو کہ) زمین (کی کائنات) اور خود تمہاری ذات میں یقین لانے والوں کیلئے (بے شمار دلائل آور و ایمان افروز) نشانیاں موجود ہیں کیا تم کو پھر بھی بصیرت حاصل نہیں ہوتی؟ (20,21/الذریت)

(اے محمدؐ! جن لوگوں کو ایسی کھلی نشانیاں اور ایسے واضح معجزات بھی دکھائی نہیں دیتے انہیں اور کیا دکھائی دے گا۔ بات یہ ہے کہ) یہ لوگ آنکھوں کے اندھے نہیں بلکہ دل کے اندھے ہیں (46/الحج)

تم انہیں نصیحت کرو یا نہ کرو ان کے لیے برابر ہے (10/یس) کہ نصیحت تو وہی قبول کرتے ہیں جو عقل و فکر سے کام لیتے ہیں (9/الزمر)

(اگر یہ لوگ عقل و فکر سے کام لینے والے ہوتے تو ان کے ایمان لانے کیلئے تمہارے کردار کا معجزہ ہی کیا کم ہے) اے محمدؐ! ان سے کہو کہ میں نے نبوت کے دعوے سے پہلے اپنی تمام زندگی تم لوگوں میں بسر کی ہے کیا تم پھر نہیں سمجھتے (کہ ایسی زندگی کسی جھوٹے کی ہوتی ہے یا سچے کی)؟ (16/یونس)

آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم کے مطالعے سے یہ حقیقت کتنی وضاحت سے بار بار سامنے آتی ہے کہ قرآن کے نزدیک کسی کو کوئی مافوق الفطرت معجزہ دکھا کر دعوت حق کی طرف بلانا (اس کی عقل کو مفلوج و ماؤف کرنا یعنی) اس کے ساتھ زبردستی کرنے کے مترادف ہے اور قرآن کے بقول ''دین میں زبردستی کی گنجائش نہیں'' (256/البقرۃ)۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نہ زبردستی کے کفر کو قابل مواخذہ مانتا ہے (106/النحل) نہ ہی زبردستی کے ایمان کو قابل ستائش جانتا ہے (14/الحجرات)

یاد رکھیئے کہ (قرآن وسنت کی رو سے) قرآن عجائب آفرینیوں کیلئے نازل نہیں کیا گیا بلکہ ہدایت کیلئے نازل کیا گیا۔ اور ہدایت عقل و فکر کو مفلوج و ماؤف کر کے حاصل نہیں ہوتی بلکہ عقل و فکر کی اصلاح سے حاصل ہوتی ہے۔ اور عقل و فکر کی اصلاح دلائل و براہین کی رو سے ہی ہاتھ آ سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منکرینِ دعوت کے مسلسل مطالبات کے باوجود خدا نے حضور اکرمؐ کو کوئی مافوق الفطرت معجزہ نہیں دیا (حالانکہ خدا کیلئے یہ ایک معمولی سی بات تھی) بلکہ ان کی توجہ ان بصیرت افروز معجزات کی طرف مبذول کرائی جن

سے عقل وفکر جاتی نہیں بلکہ آتی ہے۔

کارلائل کی مشہور کتاب (Heroes & Hero worship) کا ایک اقتباس رہ رہ کر یاد آ رہا ہے۔ اسے غور سے پڑھیے اور سوچیئے کہ وہ قرآن وسنت جس کی سمجھ اپنوں کو نہیں آتی اسے غیروں نے کتنی خوبصورتی سے سمجھ لیا ہے؟ کیا اسی بات نے اپنوں کو ترقی یافتہ سے غیر ترقی یافتہ اور غیروں کو غیر ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ بنا دیا ہے؟

کارلائل لکھتا ہے کہ

> محمدؐ نے کوئی معجزات نہیں دکھلائے۔ (معجزات کا مطالبہ کرنے والوں کو) وہ بلا توقف جواب دیتے کہ میں معجزات نہیں دکھا سکتا۔ میں تو صرف ایک مبلغ ہوں اور میرا فریضہ یہ ہے کہ خدا کی مخلوق تک خدا کا پیغام پہنچا دوں۔ محمدؐ کے نزدیک یہ کائنات خود ایک عظیم الشان معجزہ تھی۔ وہ کہتے کہ ذرا اس دنیا پر غور کرو۔ اگر تمہاری آنکھیں کھلی ہوں تو یہ خدا کا بہت بڑا معجزہ (آیت الٰہی) ہے۔ یہ زمین جسے خدا نے تمہارے لئے بنایا اور اس میں راستے متعین کیے، تم اس میں رہائش رکھتے ہو، اس میں چلتے پھرتے ہو؟ پھر ان بادلوں کو دیکھو جو خشک زمین کو سیراب کرتے ہیں۔ سوچو کہ یہ کہاں سے آتے ہیں اور کس طرح ہوا میں معلق رہتے ہیں اور پھر مردہ زمین کو نئی زندگی بخشتے ہیں۔ اس خاکِ تفتہ سے سبزہ ءنورستہ اگتا ہے اور کھجوروں کے فلک بوس درخت خوشوں سے لدے ہوئے جھومتے دکھائی دیتے ہیں۔ کیا یہ (خدا کی نشانی) آیتِ خداوندی نہیں؟ اور تمہارے مویشی، اللہ نے انہیں تمہاری خدمت گزاری کیلئے پیدا کیا۔ دیکھو گھاس ان کے اندر

پہنچ کر کس طرح دودھ میں تبدیل ہو جاتی ہے.... معجزات دیکھنا چاہتے ہو؟ کیا تم خود معجزہ نہیں ہو؟

(ذرا محمدؐ کے ان جوابات پر غور کیجئے) پاکیزہ فکر اور اشیاء کی حقیقت پر کیسی گہری نظر ہے۔ اس ذاتِ گرامیؐ میں خوددار صداقت کی والہانہ فطانت صاف جھلکتی نظر آتی ہے.... نگاہوں میں بصیرت، قلب میں گہرائی، ایک پرشکوہ فرزندِ حوا.... وہ انسان جس کی نگاہوں کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہو چکی تھی کہ یہ ساری کائنات ایک عظیم القدر معجزہ ہے (P-59,60)

مشیتِ ایزدی

کچھ روز سے نیاز احمد ایک عجیب سی الجھن میں مبتلا ہے۔اس کے ذہن میں قرآن کے بارے میں ایک بڑے ہی معقول اور جائز سوال نے ہلچل مچا رکھی ہے لیکن مولوی صاحب کی رائے یہ ہے کہ ایسی باتوں پر غور کرنے سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔

نیاز احمد نہ آرام سے جاگ سکتا ہے نہ آرام سے سو سکتا ہے۔دن بھر اپنا سوال چین نہیں لینے دیتا اور رات بھر مولوی صاحب کی رائے پریشان رکھتی ہے۔

نیاز احمد کا سوال یہ ہے کہ قرآن میں ایک طرف تو یہ لکھا ہے کہ

جس کا جی چاہے قرآن پر ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے قرآن سے انکار کر دے (29/الکھف) (یعنی جو چاہے ہدایت اختیار کر لے اور جو چاہے گمراہی اختیار کر لے) کہ انسان خود ہی ہدایت چھوڑ کر گمراہی خرید لیتا ہے (16/البقرۃ)

اور دوسری طرف یہ لکھا ہے کہ

خدا جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے (31/المدثر) اور جسے خدا گمراہ کر دے اسے کون ہدایت دے سکتا ہے (33/الرعد، 29/الروم، 36/الزمر)

یہ کیا ماجرہ ہے؟ کہ ایک طرف خدا خود ہی یہ کہتا ہے کہ انسان کو گمراہی اور ہدایت انسان کی اپنی مرضی سے ملتی ہے اور دوسری طرف خود ہی یہ بھی کہتا ہے کہ انسان کو گمراہی و

ہدایت خدا کی مرضی سے ملتی ہے؟ یہ کیسا تضاد ہے؟

پھر اس پر قرآن میں یہ بھی لکھا ہے کہ

اگر قرآن خدا کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں تضاد پایا جاتا (82/النساء) یہی وہ کتاب ہے جو برحق ہے (31/فاطر) یہی وہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں (2/البقرۃ)

نیاز احمد کا سوال انتہائی اہم ہے کیونکہ یہ سوال ہر اس شخص کے ذہن میں ضرور اٹھتا ہے جو قرآن کے مطالعے میں ذرا سی بھی عقل استعمال کرے۔ اور جو لوگ عقل استعمال نہیں کرتے انکے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں کہ قرآن انہیں حیوان بلکہ حیوان سے بھی بدتر قرار دیتا ہے (44/الفرقان) اور کہتا ہے کہ

خدا کے نزدیک بدترین مخلوق وہ لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے (22/الانفال)

(اور بہترین مخلوق یعنی) مومنین وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کے احکام بھی دیکھے سنے (یعنی سوچے سمجھے بغیر) قبول و اختیار نہیں کرتے (73/الفرقان)

قرآن کی رو سے ایمان ہوتا ہی وہی ہے جو علم و بصیرت کی بنیاد پر لایا جائے (تفصیل ''صرف ایک بات'' کے عنوان میں آپ پڑھ ہی چکے ہیں)۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے بقول قرآن پر صحیح معنوں میں ایمان لانے والے لوگ ارباب عقل و فکر (قرآنی اصطلاح میں ''اولی الالباب'') ہی ہوتے ہیں (18/الزمر، 10/الطلاق)۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نیاز احمد کا ایمان اس وقت تک خالص ہو ہی نہیں سکتا جب تک اسے دلیل و برہان کی رو سے اسکے سوال کا تسلی بخش جواب نہیں مل جاتا۔

لیکن نیاز احمد کے سوال کا جواب دینے سے پہلے ان دو آیات کی طرف بھی آپ کی توجہ دلانا ضروری ہے جس کا ترجمہ تاج کمپنی (لاہور) نے عنایت اللہ صاحب کی زبانی کچھ اس طرح شائع کیا ہے کہ

.... 'خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے، اور جو اعمال تم کرتے ہو انکے بارے میں تم سے ضرور پوچھا جائے گا'' (93/النحل)

.... ''(خدا کا عذاب اس کے لیے نہیں) جو کفر پر زبردستی مجبور کیا جائے اور جس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو، بلکہ وہ جو (دل سے اور) دل کھول کر کفر کرے تو ایسوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان کو سخت عذاب ہوگا'' (106/النحل)

غور کیجئے کہ اس ترجمے کو درست مان لینے سے خدائے رحمان و رحیم کے بارے میں کیسا تاثر قائم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو وہ لوگوں کو زبردستی گمراہ کرتا ہے اور دوسری طرف اس گمراہی کی پاداش میں انہیں سزائیں بھی دیتا ہے؟ اور پھر یہ بھی کہتا ہے کہ خدا کے عذاب کے مستحق وہ نہیں جنہیں قرآن کی نافرمانی پر مجبور کیا جائے بلکہ وہ ہیں جنہوں نے پوری رضا و رغبت کے ساتھ احکام الٰہی سے بغاوت کی ہو۔ آپ خود ہی فرمائیے کہ اس سے بڑھ کر ظلم کی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟

اب آیئے نیاز احمد کے سوال کی طرف، نیاز احمد کو اس کے سوال کا درست جواب اس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک وہ مشیت ایزدی کے مختلف گوشوں میں فرق کرنا نہیں سیکھ لیتا۔ عام طور پر مشیت ایزدی کے سبھی گوشوں کا ایک ہی مطلب لیا جاتا ہے اور اسی سے قرآن میں وہ تضاد دکھائی دینے لگتا ہے جس کی طرف نیاز احمد کی نگاہ بھی گئی۔

کیا آپ نے کبھی اس بات پر توجہ نہیں دی کہ کائنات کی ہر شے علت و معلول کے ایک سلسلے (cause and effect) میں بندھی ہوئی ہے ۔ یعنی ہر معلول (Effect) کی کوئی نہ کوئی علت (Cause) ضرور ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس سلسلے کو پیچھے کی طرف بڑھایا جائے تو ظاہر ہے کہ ایک مقام ایسا بھی آئے گا جہاں کوئی معلول بغیر کسی علت کے وجود میں آیا ہوگا۔ آسان لفظوں میں یوں کہیے کہ انڈا مرغی سے پیدا ہوتا ہے اور مرغی انڈے سے جنم لیتی ہے لیکن کبھی نہ کبھی تو کوئی انڈا مرغی کے بغیر پیدا کیا گیا ہوگا یا کوئی مرغی انڈے کے بغیر تخلیق کی گئی ہوگی۔

قرآن کہتا ہے کہ

''خدا اپنے امر سے کائنات کو (پہلی بار) وجود میں لایا اور (اسکا امر یوں کام کرتا ہے کہ) جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو بس اتنا کہتا ہے کہ 'ہوجا' اور وہ ''ہوجاتی ہے'' (117/البقرۃ، 82/یس)۔

یعنی جہاں تک کائنات کو عدم سے وجود میں لانے کا تعلق ہے تو اسکے بارے میں اس سے زیادہ نہ کچھ سمجھا جا سکتا نہ کچھ کہا جا سکتا ہے کہ خدا نے اپنی مرضی کے مطابق جیسا چاہا کر دیا کہ اس گوشے میں مشیت ایزدی کسی قاعدے اور قانون کی پابند نہیں۔

لیکن کائنات کو عدم سے وجود میں لانے کے بعد خدا کا امر پیمانوں کے قالب میں ڈھل گیا (وکان امر اللہ قدرا مقدورا 38/الاحزاب) وہ اسطرح کہ خدا نے ہر شے کیلئے ایک پیمانہ مقرر کر دیا (3/الطلاق)۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ کوئی پیمانہ اگر مقرر کر دیا جائے تو وہ قانون بن جاتا ہے۔ مثلاً خدا نے یہ پیمانہ بنایا کہ پانی ''اگر'' نکتہء انجماد پر پہنچ گیا ''تو'' وہ جم جائے گا۔ پھر یہ پیمانہ مقرر کر دیا کہ پانی ''ہمیشہ'' نکتہ انجماد پر ہی جمے گا اور یہ پیمانہ قانون بن گیا۔ لہذا

قرآن جب یہ کہتا ہے کہ خدا نے ہر شے کے لئے ایک پیمانہ مقرر کر دیا تو اسکا مطلب یہ ہے کہ ''خدا نے ہر شے کو ایک قانون کا پابند بنا دیا''۔ قانون کی تعریف ہی یہی ہوتی ہے کہ ''اگر'' یہ ہوا ''تو'' یہ ہوگا اور ''ہمیشہ'' یہی ہوگا (If-Then-Always)۔

اسی کو قانون مکافاتِ عمل (law of cause and effect) کہتے ہیں کہ اسکے تحت ہر عمل ہر حال میں از خود ہی ایک خاص نتیجہ مرتب کر لیتا ہے (اس حوالے سے توبہ والے باب میں بھی بات ہو چکی ہے)۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اب مشیت ایزدی خود خدا ہی کی مرضی سے ایک قاعدے اور قانون کی پابند ہوگئی۔ یعنی اب نہ انڈا مرغی کے بغیر پیدا ہو سکتا ہے نہ مرغی انڈے کے بغیر جنم لے سکتی ہے۔

خارجی کائنات قانون مکافاتِ عمل کی پابندی پر بھی مجبور ہے اور احکام الٰہی کی پابندی پر بھی مجبور ہے۔ مثلاً احکام الٰہی کے مطابق انڈا مرغی ہی دے سکتی ہے (مرغا نہیں دے سکتا) اور قانون مکافاتِ عمل کے مطابق ''اگر'' مرغی کو ایک خاص ماحول میسر آئے گا ''تو'' ہی وہ انڈا دے سکے گی اور ''ہمیشہ'' ایسا ہی ہوگا۔ یا مثلاً زمین احکام الٰہی کے تحت بیک وقت اپنے محور اور سورج کے گرد از خود ہی گھومتی رہتی ہے اور قانون مکافات عمل کے تحت زمین کے اس عمل سے از خود ہی دن رات اور موسم بنتے ہیں۔

جبکہ انسان قانون مکافات عمل کی پابندی پر تو مجبور ہے لیکن احکام الٰہی کی پابندی پر مجبور نہیں۔ وہ اسطرح کے اس بات کا انحصار انسان کی اپنی مرضی پر ہے کہ وہ احکام الٰہی (یعنی قرآن) کی اطاعت کرے یا نہ کرے (29/الکھف) لیکن ''اگر'' وہ احکام الٰہی کی اطاعت کرے گا ''تو'' اسے (قانونِ مکافات عمل کے تحت) لازمی طور پر جنت ملے گی (82/البقرۃ) اور ''اگر'' احکام الٰہی کی اطاعت نہیں کرے گا ''تو'' وہ لازمی طور پر جہنم میں جائے گا (81/البقرۃ)۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ انسان کو اس بات کا تو پورا اختیار

حاصل ہے کہ وہ دودھ پیئے یا زہر لیکن اس بات کا اختیار حاصل نہیں کہ وہ دودھ سے زہر کے نتائج پیدا کر سکے۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن کی رو سے مشیت ایزدی کے تین گوشے ہیں۔ پہلے گوشے میں مشیت ایزدی کسی قانون کی پابند نہیں کہ یہاں

.... خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے (107/ھود، 14/الحج)

.... وہ جیسا چاہتا ہے فیصلہ کر دیتا ہے (1/المائدہ)

.... وہ جو چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے (45/النور، 68/القصص)۔

لیکن دوسرے اور تیسرے گوشے میں مشیت ایزدی خدا ہی کی مرضی سے ایک خاص قانون کی پابند ہے جسے مکافات عمل کا قانون (قرآن کی اصطلاح میں کلمۃ اللہ اور سنت اللہ) کہتے ہیں۔ کیا آپ کی نظر سے کبھی اس قسم کی آیات نہیں گزریں کہ

.... خدا نے اپنے اوپر لازم قرار دے دیا ہے کہ اسکے رسول غالب رہیں گے (21/المجادلۃ)

.... خدا نے اپنے اوپر لازم قرار دے دیا ہے کہ وہ مومنین کی مدد کرے گا (47/الروم)

.... اس نے مومنین کو ہر قسم کی تباہی سے محفوظ رکھنا اپنے اوپر فرض قرار دے دیا ہے (103/یونس) وغیرہ وغیرہ۔

ان آیات میں ''خدا نے اپنے اوپر اس بات کو لازم قرار دے دیا ہے'' کا مطلب یہی ہے خدا نے اپنی مرضی سے اپنے آپ کو ایک قانون کا پابند بنا دیا ہے جو کبھی بھی تبدل و تحول کا شکار نہیں ہوتا (77/بنی اسرائیل، 62/الاحزاب، 43/فاطر وغیرہ وغیرہ)۔

یعنی مشیتِ ایزدی کا

.... پہلا گوشہ وہ ہے جس میں اشیائے کائنات کو عدم سے وجود میں لایا جاتا ہے اور پھر انکے لیے احکام وقوانین وضع کیے جاتے ہیں۔

.... دوسرا گوشہ خارجی کائنات کے متعلق ہے اور خارجی کائنات خدا کی مرضی کے مطابق عمل کرنے پر بھی مجبور ہے اور قانون مکافات عمل کی اطاعت پر بھی مجبور ہے۔ یعنی خارجی کائنات کی ہر شے طوعاً وکرعاً وہی کرتی ہے جو خدا اسے کرنے کیلئے کہتا ہے (50/النحل) اور کسی شے کو بھی احکام الٰہی سے سرکشی کا اختیار حاصل نہیں (49/النحل)۔

.... تیسرا گوشہ انسانی ذات کے متعلق ہے اور انسان قانون مکافات عمل کی اطاعت پر تو مجبور ہے لیکن خدا کی مرضی کے مطابق عمل کرنے پر مجبور نہیں۔ اس گوشے کے بارے میں بڑے صاف الفاظ میں کہا گیا کہ ''تم جو چاہو کرو (خدا مداخلت نہیں کرے گا) لیکن تم جو کچھ کرو گے خدا وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے'' (40/حم السجدۃ) یعنی تم اپنی مرضی سے کوئی عمل بھی کر سکتے ہو لیکن اس عمل کا نتیجہ تمھاری مرضی کے مطابق نہیں بلکہ قانونِ مکافات عمل کے مطابق مرتب ہوگا۔

بات یہ ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں ''من یشاء'' کا لفظ آیا ہے وہاں یہ دیکھنا یہ ہوگا کہ اسکا تعلق مشیت ایزدی کے کونسے گوشے سے ہے اور اسی اعتبار سے اسکا مفہوم واضح ہوگا۔ مثلاً جہاں یہ کہا گیا کہ ''خدا جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے''۔ تو یہ بات مشیت کے تیسرے گوشے کے متعلق ہے لہذا یہاں ''من یشاء'' کے معنی قانون مکافات عمل ہونگے۔ اور اس آیت کا درست مفہوم یہ ہوگا کہ

گمراہی و ہدایت خدا کے بنائے ہوئے قانون مکافات عمل کے تحت

ملتی ہے

اس مفہوم کی تصدیق و وضاحت دیگر مقامات پر یوں کی گئی کہ

گمراہی اسی کو ملتی ہے جو گمراہ ہونا چاہتا ہے (16,26/البقرۃ) اور ہدایت اسی کو ملتی ہے جو ہدایت حاصل کرنا چاہتا ہے (27/الرعد، 16/المائدہ وغیرہ)

جہاں یہ کہا گیا کہ ''جسے خدا گمراہ کر دے اسے کون ہدایت دے سکتا ہے''۔ تو اس کا درست مفہوم یہ ہوگا کہ

جسے قانون مکافات عمل گمراہ کر دے اسے کون ہدایت دے سکتا ہے۔

وہ اسطرح کہ قانون مکافات عمل اسی کو گمراہ کرتا ہے جو اپنی مرضی سے گمراہ ہونا چاہتا ہے اور ظاہر ہے کہ جو اپنی مرضی سے گمراہ ہونا چاہے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔

جہاں یہ کہا گیا کہ ''خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے۔ اور جو اعمال تم کرتے ہو انکے بارے میں تم سے ضرور پوچھا جائے گا''۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ

گمراہی اور ہدایت قانونِ مکافات عمل کے تحت ملتی ہے (اور اس قانون کی رو سے گمراہی اور ہدایت تمھاری اپنے ہی اعمال کا فطری نتیجہ ہے) لہٰذا جو اعمال تم کرتے ہو انکے لیے جواب دہ بھی تم خود ہی ہو گے۔

اسی طرح کی کئی اور آیات بھی ہیں مثلاً

خدا جسے چاہے معاف کر دے جسے چاہے سزا دے (129/ال

عمران) خدا جسے چاہے عزت دے جسے چاہے ذلیل کر دے(26/ال عمران)

درست مطلب یہ ہے کہ

معافی و عزت ہو یا سزا و ذلت، خدا کے بنائے ہوئے قانون (مکافاتِ عمل) کے تحت ملتی ہے۔

اور اس مفہوم کی تصدیق اس قسم کی واضح آیات سے ہو جاتی ہے کہ اے نوع انسانی! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے (قرآن کی صورت میں) واضح دلیل آ گئی ہے(174/النساء) تا کہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ دلیل (قانون) کی رو سے ہلاک ہو اور جو زندہ رہنے والا ہے وہ دلیل (قانون) کی رو سے زندہ رہے (42/ الانفال)۔

نیاز احمد کو یہ نکتہ بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے (جو ''کیا موت کا ایک دن مقرر ہے'' کے عنوان میں تفصیل کے ساتھ لکھ دیا گیا ہے) کہ قرآن ہر اس بات کو براہِ راست خدا سے منسوب کر دیتا ہے جو خدا کے قانون کے تحت عمل میں آتی ہے۔ یعنی قرآن جب یہ کہتا ہے کہ خدا نے فلاں کام کیا تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ خدا نے وہ کام اپنے ہاتھ سے کیا ہے۔

مثلاً خدا نے بذاتِ خود انسان کو بولنا لکھنا اور شکار کرنا نہیں سکھایا لیکن انسان کیونکہ خدا کے بنائے ہوئے قانونِ فطرت کے تحت یہ سب سیکھتا ہے، لہذا قرآن کہتا ہے کہ خدا نے انسان کو بولنا سکھایا(4/الرحمٰن) خدا نے انسان کو قلم سے لکھنا سکھایا(4/العلق، 282/البقرۃ) خدا نے انسان کو شکار کرنا سکھایا(4/المائدہ)۔ ان آیات کا درست مفہوم یہ

ہوگا کہ خدا کے قانون نے انسان کو بولنا لکھنا اور شکار کرنا سکھایا۔

آپ خود ہی سوچیے کہ اگر خدا کے شکار سکھانے کا مطلب یہ نہیں کہ خدا نے اپنے ہاتھ سے انسان کو شکار کی تربیت دی تو پھر خدا کا ہدایت و گمراہی وغیرہ دینے کا مطلب فی الواقعہ خدا کا ہدایت و گمراہی دینا کیسے ہوسکتا ہے؟

امید ہے کہ اب نیاز احمد یہ بات اچھی طرح سمجھ چکا ہوگا کہ تضاد قرآن میں نہیں بلکہ قرآن کے ان روایت زدہ تراجم و تفاسیر میں ہے جنہیں ہم صدیوں سے سوچے سمجھے بغیر درست مانتے چلے آرہے ہیں۔

توحید کے دشمن

اس سے بڑھ کر تشویش کی بات اور کیا ہو گی کہ خدا نے دین میں تفرقہ پھیلانے والی مسجدوں کو خدا اور رسولؐ کے دشمنوں کی کمیں گاہیں قرار دیا ہے کہ وہاں عبادت نہیں کی جاتی بلکہ کفر کیا جاتا ہے (107/التوبۃ) لیکن مسلمانوں نے انہی مسجدوں میں سجدے کر کر کے اپنی پیشانیوں پر محرابیں بنالی ہیں۔

قرآن گواہ ہے کہ ایسی ایک مسجد حضور اکرمؐ کی زندگی میں تعمیر کی گئی تو خدا نے آپؐ کو اس مسجد میں (نماز پڑھنا تو دور کی بات) کھڑے ہونے سے بھی منع فرمایا اور کہا کہ

> اور (ان میں ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس غرض سے مسجد بنائی ہے کہ (اسلام کو) نقصان پہنچائیں اور کفر کریں یعنی مومنوں میں تفرقہ ڈالیں اور جو لوگ خدا اور رسولؐ سے جنگ کر چکے ہیں، ان کے لیے گھات کی جگہ بنائیں۔ یہ لوگ قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم نے اس مسجد کو نیک نیتی سے تعمیر کیا ہے، لیکن خدا اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ یہ لوگ بالکل جھوٹے ہیں۔ اے رسول تم اس مسجد میں (جس سے تفرقہ پھیلے) قدم تک نہ رکھنا (108/التوبۃ)
>
> اے محمدؐ تیرا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں جو دین میں تفرقہ پیدا کریں اور خود فرقوں میں تقسیم ہو جائیں (159/الانعام) (جبکہ انہیں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ) صلوۃ قائم رکھو اور مشرکین میں

شامل نہ ہو جاو یعنی ان لوگوں میں شامل نہ ہو جاو جنہوں نے دین میں تفرقہ ڈال دیا اور خود فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ ہر فرقہ اس خیال میں خوش ہے کہ وہی سچا ہے (باقی سب جھوٹے ہیں)'' (32-31/ الروم)

چناچہ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ

....وہ ہم میں سے نہیں جو عصبیت کی طرف بلائے (مسلم)

....وہ ہم میں سے نہیں جو عصبیت کے باعث لڑے اور عصبیت پر مرے (ابوداؤد)

....وہ جو بلاتا ہو تعصب اور قومی طرفداری کی طرف یا مدد کرتا ہو قومی تعصب کی تو اس کا قتل جاہلیت کا سا ہوگا (مسلم)

....ایمان والے ایک جسم کی طرح ہیں (مسلم)

....ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے دیوار کی طرح ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے (متفق علیہ)

....تم مسلمانوں کو آپس میں مہربانی، محبت اور شفقت کرتے ہوئے یوں دیکھو گے جیسے ایک جسم، جب ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو سارے جسم کے اعضا بے خوابی اور بخار کی طرف ایک دوسرے کو بلاتے ہیں (متفق علیہ)

....ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے (متفق علیہ)

قرآن وسنت کی رو سے تفرقہ بازی ''شرک'' اور فرقے بنانے یا فرقے بننے والے لوگ ''مشرک'' ہیں لیکن اس کے باوجود آج دنیا میں غالباً کوئی ایک مسلمان بھی ایسا

نہیں جو کسی فرقے میں شامل نہ ہو یا اسے کسی فرقے میں شامل نہ کر لیا گیا ہو۔ اور کوئی ایک فرقہ بھی ایسا نہیں جو کسی دوسرے فرقے کی نگاہ میں (باقاعدہ طور پر) کافر نہ ہو۔

خدا کہتا ہے کہ

.... کیا ہم نے کوئی ایسی دلیل نازل کی ہے جو خدا کے ساتھ شرک (تفرقہ بازی) سکھاتی ہے (35/الروم)

....ہم نے تو قرآن اس لیے نازل کیا تھا کہ اس کے ذریعے اختلافات مٹا دیے جائیں (64/النحل)

....یہ دین کا کوئی نیا راستہ نہیں جو تمھارے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ یہ تو وہی راستہ ہے جسکا حکم نوحؑ کو تھا جسے تمہاری طرف وحی کیا جاتا ہے جس کا حکم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو تھا (انکے لئے بھی یہی حکم تھا اور تمہارے لئے بھی یہی حکم ہے) کہ اس دین کو قائم کرو اور اس میں کسی قسم کا تفرقہ پیدا نہ کرو (13/الشوریٰ) اے پیغمبر و تمہاری امت ایک ہی امت (امت واحدہ) ہے (52/المومنون، 92/الانبیاء) (لیکن) علم (تفرقہ بازی سے بچنے کی واضع ہدایت یعنی قرآن) آچکنے کے بعد بھی اگر لوگ الگ الگ ہیں (یعنی فرقوں اور پارٹیوں میں بٹے ہوئے ہیں) تو اسکی وجہ ایک دوسرے کی ضد ہے (14/الشوریٰ، 17/الجاثیہ)

....ان لوگوں کے دلوں پر (اپنے برے اعمال کی وجہ سے) مہریں لگ چکی ہیں کہ یہ لوگ خواہشات اور جذبات کی پیروی کرتے ہیں (16/محمدؐ)

ابو جہل بھی تو یہی کہتا تھا کہ ''میں محمدؐ پر کسی صورت میں بھی ایمان نہیں لاؤں گا کیونکہ آپؐ کے خاندان اور میرے خاندان میں شرف وعظمت کا جھگڑا (یعنی ضد) ہے'' ورنہ اسے آپؐ کی سچائی پر تو کوئی شک نہیں تھا۔

خدا کے نزدیک تو ''فرقہ پرستی'' ''بت پرستی'' سے بھی بڑا شرک ہے۔قرآن میں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل کو حضرت ہارونؑ کے حوالے کر کے حضرت موسیٰؑ کچھ روز کے لئے باہر تشریف لے گئے۔واپسی پر کیا دیکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے ''گوسالہ پرستی'' اختیار کر رکھی ہے(88/طٰہٰ)۔

چنانچہ حضرت موسیٰؑ سخت غصے کے عالم میں حضرت ہارونؑ سے پوچھتے ہیں کہ
جب تم نے دیکھا کہ لوگ گمراہ ہو رہے تھے تو وہ کونسی بات تھی جسکی وجہ
سے تم نے انہیں (اس گمراہی سے) نہیں روکا (92/طٰہٰ)
اور حضرت ہارونؑ (جو بذات خود بھی خدا کے نبی ہیں) جواب دیتے ہیں کہ
مجھے (اس بات کا) خدشہ تھا کہ کہیں آپؑ آ کر یہ نہ کہہ دیں کہ
(ہارون) تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور میرے فیصلے کا
انتظار نہیں کیا (94/طٰہٰ)

یعنی بت پرستی سے روکنے کی کوشش انہیں تقسیم کر دیتی (کچھ لوگ حضرت ہارونؑ کی حمایت اور کچھ مخالفت کرتے) جسکا نتیجہ فساد اور خون ریزی ہوتا۔لہذا بڑے شرک (یعنی تفرقہ بازی) سے بچانے کے لئے حضرت ہارون نے انہیں چھوٹے شرک (یعنی بت پرستی) سے نہیں روکا۔اور قرآن گواہ ہے کہ بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کا ازالہ تو خدا کے حضور انکی توبہ سے ہو گیا (54/البقرۃ) لیکن تفرقہ بازی کی سزا عذاب عظیم (یعنی ہمیشہ کا عذاب) ہے (105/ال عمران) کیونکہ بت پرستی کے برعکس تفرقہ بازی ''ایمان لانے کے

بعد کفر کرنا'' ہے (108/ال عمران)۔

یہ بات اتنی حیرت انگیز نہیں کہ تفرقہ بازی کے خلاف سخت ترین اور واضع ترین قرآنی احکام پڑھنے یا سننے کے باوجود فرقہ پرست مسلمانوں کے پیروں کے نیچے سے زمین کیوں نہیں نکلتی کیونکہ ''ہر فرقہ اسی خیال میں خوش ہے کہ وہ حق پر ہے'' (32/الروم) لیکن یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ مسلمانوں کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ کوئی فرقہ بھی حق پر کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اسلام میں کسی فرقے یا فرقہ پرست کی گنجائش سرے سے ہے ہی نہیں (159/الانعام)۔

تفرقہ بازی کی بنیادی وجہ خدا کا وہ تصور ہے جو مختلف فرقوں نے اپنی اپنی خواہشات وجذبات کے مطابق قائم کیا ہوا ہے۔ یعنی ان لوگوں کی خواہشات وجذبات ہی دراصل ان کا خدا ہیں (43/الفرقان، 50/القصص، 3/القمر وغیرہ)۔ ہر فرقے کا خدا دوسرے فرقے کے خدا سے مختلف ہے۔ یعنی جن چیزوں سے ایک فرقے کا خدا خوش ہوتا ہے وہی چیزیں دوسرے فرقے کے خدا کو ناگوار گزرتی ہیں۔ ان حالات میں وحدت کہاں سے آئے؟

خدا کہتا ہے کہ

> دین نہ انفرادی مسلک کا نام ہے نہ گروہ بندیوں کا۔ لہذا تمہارے لیے ضروری ہے کہ تم سب کے سب (بلا استثناء) اجتماعی طور پر قرآن کے ساتھ محکم طور پر وابستہ رہو اور تفرقہ بازی کو اپنے قریب نہ آنے دو۔ کیا تمہیں اپنی پچھلی حالت یاد نہیں کہ جب تم میں قرآن نہیں تھا اور جب تم اجتماعی زندگی کے بجائے فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ تم ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ خدا نے تمہیں اس

حالت میں قرآن عطا کیا جس سے تمہارے دل ایک دوسرے سے جڑ گئے اور تم بھائی بھائی بن گئے۔ ایمان کے رشتے میں منسلک ہو کر تم سب کا ایک برادری بن جانا خدا کا کتنا بڑا انعام ہے۔ تم ہلاکت اور تباہی کے جہنم کے کنارے پر پہنچ چکے تھے لیکن قرآن نے تمہیں اس میں گرنے سے بچالیا (103/ال عمران)۔

آپ نے دیکھا کہ تفرقہ بازی سے بچنے کی واحد صورت قرآن سے گہری وابستگی ہے کیونکہ قرآن ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے خدا کا غیر متبدل و درست تصور سامنے آتا ہے۔ ورنہ انسان کا محدود ذہن اپنے خالق کی لامحدود ہستی کے بارے میں اپنے طور پر متبدل اور غلط تصور ہی قائم کر سکتا ہے۔ کیونکہ خدا کی ذات انسان کے ادراک سے باہر ہے (104/الانعام) اور خدا کی کوئی مثال بھی نہیں کہ اسکی ذات کو کسی مثال سے سمجھایا جا سکے (11/الشوریٰ)۔

جب تک مسلمان قرآن کی روشنی میں قرآن کو سمجھتے رہے انکے دل ایک دوسرے سے جڑے رہے کیونکہ ہر مسلمان کے سامنے خدا کا ایک ہی جیسا تصور تھا۔ لیکن جب مسلمانوں نے قرآن کو خود ساختہ روایات کی روشنی میں سمجھنا شروع کر دیا تو انکے دل ایک دوسرے سے جدا ہو گئے کیونکہ ہر مسلمان کے سامنے خدا کا ایک جیسا تصور نہیں رہا۔

قرآن کے مطابق خدا نے ہر نبی کے ذریعے تفرقہ بازی سے بچنے اور توحید کو اپنانے کی تعلیم عام کی (13/الشوریٰ)۔ لیکن ہر نبی کی قوم نے خدا کے دشمنوں (قرآن کی اصطلاح میں ''مترفین'') کی قیادت میں احکام الٰہی کی پیروی کے بجائے باپ دادا کی روایات کا اتباع کیا (تفصیل ''دل کے اندھے'' میں آپ پڑھ چکے ہیں) اور نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ وہ انبیائے کرام جن کی ساری زندگی اس جدوجہد میں گزری کہ وہ انسانوں

کے اختلافات مٹا کر محبت و بھائی چارے سے تمام نوع انسانی کو ایک کر دیں، انہی انبیائے کرام کے نام پر انسان ایک دوسرے کے گلے کاٹ رہے ہیں۔

مترفین (یعنی دوسروں کی محنت پر تن آسانی کی زندگی بسر کرنے والے استحصالی طبقے) لوگوں کو پارٹیوں اور فرقوں میں اس لیے تقسیم کر دیتے ہیں کہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ الجھے رہیں اور کسی کی توجہ اس حقیقت کی طرف جا ہی نہ سکے کہ ان کی محرومیوں اور مجبوریوں کے پیچھے دراصل مترفین کا ہاتھ ہے۔ مترفین لوگوں کے دلوں میں (مختلف حیلوں اور بہانوں سے) ایک دوسرے کے خلاف اتنی شدید نفرت پیدا کر دیتے ہیں کہ اگر کوئی ایک گروہ ان کے خلاف کھڑا ہو بھی جائے تو کوئی دوسرا گروہ مترفین کی حمایت پر اتر آتا ہے۔

قرآن گواہ ہے کہ فرعون نے بھی (قارون اور ہامان) کی مدد سے ملک کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر رکھا تھا (4/القصص) تا کہ اس کا اقتدار قائم رہے۔

یاد رکھئے کہ قرآنی تعلیمات کا خلاصہ توحید ہے اور توحید کا لازمی نتیجہ وحدتِ انسانیت ہے۔ توحید کا مطلب دل کی گہرائی سے اس بات کا اقرار و اظہار ہے کہ ''خدا کے سوا کوئی اس قابل نہیں کہ اسے آئیڈیل (Ideal) تسلیم کیا جائے'' (لاالہ الااللّٰہ) لیکن یہ خدا انسانی ذہن کا تراشا ہوا خدا نہیں جو کسی کے چڑھاووں یا وظیفوں کی وجہ سے اپنے فیصلے تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ خدا تو ان صفات سے پہچانا جاتا ہے جو وحی کی صورت میں نبی آخرالزماںؐ پر نازل ہوئیں (محمد رسول اللّٰہ) اور یہ صفات مستقل بالذات ہیں کیونکہ خدا کا دستور کسی صورت میں بھی تبدل و تحول کا شکار نہیں ہوتا (43/فاطر، 64/یونس)۔ (اس موضوع پر تفصیل سے بات ''خدا کا تصور'' والے باب ہوگی)

خدا کی چند صفات تو خالصتاً اسکی لامحدودیت سے متعلق ہیں مثلاً وہ اول و آخر ہے، وہ ظاہر و باطن ہے، وہ حاضر و ناظر ہے وغیرہ لیکن باقی صفات ایک خاص حد تک انسان

میں بھی پوشیدہ ہیں کیونکہ خدا نے انسان میں اپنی روح پھونک رکھی ہے (9/السجدۃ)۔

خدا کو آئیڈیل مان لینے کا مطلب یہ ہے کہ اسکی ذات کو بطور نمونہ اپنے سامنے رکھ کر اپنی ذات کو اسکے رنگ میں رنگنے کی جستجو کو زندگی کا نصب العین بنا لیا جائے۔ یعنی اپنی ذات میں بشریت کی حد تک خدا کی چھپی ہوئی صفات کو اجاگر کرتے چلے جانا۔ وہ اسطرح کہ اپنے کردار میں رحمانیت، رزاقیت، ربوبیت، جباریت وغیرہ پیدا کرنا۔

اسی لیے تو اقبالؒ نے کہا کہ

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

جس انسان کے کردار میں خدا کی صفات جتنی نمایاں ہونگی وہ اتنا ہی ''متقی'' یعنی خدا کے قریب ہوگا۔ یہ ہوتی ہے قرآن کی رو سے توحید یعنی ایک خدا پر ایمان لانا۔

قرآن کے بقول

(اے اہل ایمان) ان (نصاریٰ) سے کہو کہ ہم نے خدا کا رنگ اختیار کر لیا ہے اور خدا سے بہتر رنگ اور کس کا ہوسکتا ہے۔ اور ہم (خدا کو آئیڈیل ماننے والے یعنی) خدا کی محکومی و اطاعت کرنے والے لوگ ہیں (138/البقرۃ)۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ قرآن نے خدا کی صفات کو ''اسماء الحسنیٰ'' کہا ہے یعنی ان میں حسن ہے اور حسن کہتے ہیں درست تناسب کو۔ انسان میں بھی ان صفات کا حسنیٰ ہونا ضروری ہے کیونکہ جباریت میں حسن نہ رہے تو وہ بربریت بن جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ صفات

اس طرح حسنہ ہوسکتی ہیں کہ ان کا اظہار قرآن کی مقرر کردہ حدود و قیود میں ہو۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ خدا نے جس صفت کے اظہار کے لیے جو حالات بتائے ہوئے ہیں اس صفت کا اظہار انہی حالات میں ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر قرآن کریم میں یہ لکھا ہوا ہے کہ

> یہ لوگ (مومنین) اس طرح ایک برادری کے افراد بن کر زندگی بسر کرتے ہیں کہ جب ان پر کسی طرف سے زیادتی ہوتی ہے تو یہ مل کر اپنے بچاؤ کا انتظام کرتے ہیں اور زیادتی کرنے والے سے بدلہ لیتے ہیں..... لیکن اگر وہ دیکھتے ہیں کہ زیادتی کرنے والا اپنے کیے پر نادم ہے اور اگر اسے معاف کر دیا جائے تو اس کی اصلاح ہوسکتی ہے تو وہ درگزر کرتے ہیں (39,40/الشوری)

یعنی اگر مومنین کے ساتھ کوئی ظلم کرے تو ان کی طرف سے ''انتقام'' والی صفت سامنے آتی ہے (کہ اس سے ظلم کی روک تھام ہوتی ہے) لیکن اگر بدلہ لیے بغیر ہی اصلاحِ احوال ہو تو ''عفو و درگزر'' والی صفت سامنے آتی ہے۔

آپ خود ہی سوچیے کہ اگر سب کے سامنے خدا کا قرآنی تصور ہو اور ہر کوئی اس پر اس طرح ایمان لائے جس طرح ایمان لانے کا حق ہے یعنی اپنے اندر بشریت کی حد تک خدا کی صفات کو اجاگر کرتا چلا جائے (اپنے آپ کو خدا کے رنگ میں رنگتا چلا جائے) تو کسی قسم کا کوئی اختلاف پیدا ہو ہی کیسے سکتا ہے؟

کاش روایات کی روشنی میں انسانی ذہن کے تراشے ہوئے خدا پر ایمان لانے والے مسلمان قرآن کی روشنی میں مستقل بالذات صفات کے حامل خدا پر ایمان لا کر اسلام کی سرزمین سے تفرقہ بازی کے درخت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیں۔

اقبالؒ نے کہا تھا کہ

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کو یہی باتیں ہیں

ایصالِ ثواب

حویلی کے باہر خوشبودار کھانوں کے درجنوں دیگیں پک رہی تھیں اور حویلی کے اندر دینی مدرسوں کے سینکڑوں طالب علم اپنے اپنے مولوی صاحبان کے ہمراہ جھوم جھوم کر قرآن خوانی کر رہے تھے۔ ملک داؤد کے والد کا قل تھا اور وہ اپنے والد کو ہر قیمت پر بخشوانا چاہتا تھا۔

قرآن خوانی میں شامل تمام دینی مدرسوں کے لیے ایک ایک لاکھ روپے کے چندے کا اعلان کیا گیا تھا اور بڑے مولوی صاحب کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ بڑے ملک کی روح کو ننانوے بار پورے قرآن کا ثواب پہنچایا جائے (ننانوے بار اس لیے کہ خدا کی صفات بھی ننانوے ہوتی ہیں) ۔

مولوی صاحب نے بتایا تھا کہ ایسے قل پر تو بڑے بڑے نیک لوگ بھی رشک کریں گے، اور ملک داؤد کو اپنے والد کی مغفرت یقینی دکھائی دینے لگی تھی، وہ بڑا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ لیکن اس کا ڈرائیور نورا یہ سوچ کر بڑا بے چین ہو گیا تھا کہ

.... کیا خدا یہ نہیں جانتا کہ اگر ملک داؤد بھی میری طرح غربت و بے کسی کی چکی میں پس رہا ہوتا تو اس کے والد کا قل بھی میرے والد کے قل کی طرح محدود ہوتا؟

.... کیا یہ ظلم نہیں کہ بڑے ملک کو محض دولت مند ہونے کی بنا پر زیادہ ثواب ملے اور میرے والد کو غریب ہونے کی بنا پر کم؟

.... کیا خدا کو یہ بھی معلوم نہیں کہ پیسے کے زور پر تو مولوی حضرات سے کسی لئے بھی ساری زندگی قرآن خوانیاں اور دعائیں کروائی جا سکتی ہیں کہ ان حضرات کا تو پیشہ ہی یہی ہے؟ لیکن خدا تو ہر بات کا علم رکھتا ہے؟ تو پھر کیا خدا بھی پیسے کے آگے مجبور ہو جاتا ہے؟ کیا پیسے سے جنت بھی خریدی جا سکتی ہیں؟

نورے کی الجھن بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی لیکن قرآن خوانی ختم ہوگئی۔ ننانوے بار قرآن پڑھا گیا۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں مرتبہ یہ اور اس طرح کی دیگر آیات بھی پڑھی گئیں کہ

.... جو کوئی نیک کام کرے گا اس کا اجر بھی اسی کو ملے گا اور جو کوئی برا کام کرے گا اس کا ضرر بھی اسی کو پہنچے گا کہ تمھارا خدا کسی پر ظلم کرنے والا نہیں (46/حم السجدۃ نیز دیکھیے 44/الروم، 7/بنی اسرائیل وغیرہ وغیرہ)

.... جو دیکھ کر چلے گا اس کا فائدہ اسی کی ذات کو ہوگا اور جو اندھا بن کر چلے گا اس کا نقصان اسی کی ذات کو ہوگا (104/الانعام)

.... جو ہدایت حاصل کرتا ہے اس ہدایت سے وہ اپنا ہی بھلا کرتا ہے اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے اس گمراہی سے وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔ کوئی کسی کا وکیل نہیں بن سکتا (108/یونس)

.... جو لوگ گزر چکے ہیں ان کو وہی ملے گا جو انہوں نے کیا اور تم کو وہی ملے گا جو تم نے کیا (141/البقرہ) ان کو انکے اپنے اعمال کا بدلہ ملے گا اور تم کو تمھارے اپنے اعمال کا (139/البقرۃ نیز دیکھیے 134/البقرۃ، 41/یونس، 35/ہود)

غور کیجئے کہ جن آیات کے ذریعے بڑے غیر مبہم اور دوٹوک الفاظ میں یہ حقیقت بیان کی گئی کہ ہر شخص کو اس کے اپنے ہی اعمال کا صلہ ملے گا اور کوئی شخص بھی اپنے اعمال کا ثواب کسی بھی دوسرے شخص کو منتقل نہیں کرسکتا ان آیات کا ثواب بھی بڑے ملک کی روح کو پہنچایا گیا؟

ہم مسلمانوں کا فکری زوال ہمیں کتنی پست سطح پر لے آیا ہے کہ ایک طرف تو ہم لوگ قرآن کو زندگی کا نصب العین مانتے ہیں لیکن دوسری طرف اتنا بھی نہیں جانتے کہ قرآن میں لکھا ہوا کیا ہے؟ ایک طرف تو ہمارے سر پر ہر وقت ثواب کمانے کی دھن سوار رہتی ہے لیکن دوسری طرف ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ثواب کہتے کسے ہیں اور ثواب ملتا کس طرح ہے؟

ثواب کے بارے میں عام طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ
ثواب نیکیوں کے بدلے میں ملنے والی کسی ایسی چیز کا نام ہے جس سے خدا خوش ہوتا ہے، یہ دنیا میں نہیں مل سکتا کہ اس کا تعلق خالصتاً آخرت سے ہے اور یہ غیر محسوس شکل میں ملتا ہے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ثواب ملتا کس طرح ہے تو اس کے بارے میں یہ گمان کیا جاتا ہے کہ جس طرح کوئی ممتحن امتحانی پرچوں کی پڑتال کے بعد ان پر نمبر لگاتا ہے اسی طرح خدا بھی نیکیوں کی پڑتال کے بعد ان پر ثواب لگاتا ہے۔ یہ سب قیاس آرائیاں قرآنی تعلیمات کے بالکل خلاف ہیں۔

لغت کی رو سے

ثَابَ. یَثُوْبُ. ثَوْباً کہ معنی ہے چلے جانے کے بعد واپس آجانا۔
ثَابَ جِسْمُہ، ثَوَبَاناً وَ اَثَابَ۔ اس کا جسم بیماری کے بعد پھر اپنی

اصل حالت پر آنے لگا اور اس طرح ضائع شدہ توانائی اور صحت پھر عود کر آئی (تاج العروس، محیط المحیط۔ نیز ابن قتیبہ) ثَابَ الْمَاءُ۔ پانی نکالے جانے کے بعد پھر اتنا ہی آ گیا۔ بحال ہو گیا (تارج العروس)۔ الثَّائِبُ مِنَ الْبَحْرِ جزر کے بعد سمندر کا بچ رہنے والا پانی۔ بِئْرٌ ثَیِّبٌ۔ وہ کنواں جس میں دوبارہ پانی پلٹ آئے اور جمع ہو جائے (تاج العروس، محیط المحیط۔ نیز ابن قتیبہ) کتاب الاشقاق میں ہے کہ ثَابَ یَثُوْبُ کے معنی رَجَعَ (واپس آ جانے) کے ہیں۔ کُلُّ رَاجِعٍ ثَائِبٌ۔ ہر واپس آنے والے کو ثائب کہا جاتا ہے۔ ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ہیں۔

آپ کوئی کام بھی کریں اس میں Investment کے طور پر آپ کو کچھ نہ کچھ تو سرف کرنا ہی پڑتا ہے۔ اور اگر آپ کا وہ کام ہو جائے تو Return کے طور پر آپ کو کسی نہ کسی شکل میں آپ کی Investment واپس بھی مل جاتی ہے۔ اس بحالی/بازیابی (Restoration) کو ثواب کہتے ہیں۔

مثال کے طور پر آپ کسی بیماری کا علاج کرواتے ہیں۔ صحت یابی کے لئے (ڈاکٹر سے معائنہ کروانے، اس کی لکھی ہوئی دوائی خریدنے اور کھانے میں) آپ وقت، توانائی، توجہ اور دولت کی شکل میں جو کچھ صرف (Invest) کرتے ہیں وہ صحت یابی کی شکل میں آپ کو واپس مل جاتا ہے۔ یہی بازیابی (Return) ثواب کہلاتی ہے۔

ثواب کے درست مفہوم کو ان آیات سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ

.....حکومت سب خدائے برحق کی ہے۔ اسی کا ثواب بہتر اور اسی کا بدلہ اچھا ہے (44/الکہف)

.....ان (قرآن کو زندگی کا نصب العین بنانے والوں) کو بہشتوں میں داخل کیا جائے گا، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ یہ خدا کے ہاں سے ثواب ہے اور خدا کے ہاں بہت اچھا ثواب ہے (195/ال عمران)

.....کافروں کے اعمال ہی ثواب بن کر ان کی طرف لوٹ آتے ہیں'' (36/المطففین) (اس آیت سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ثواب فقط اچھے اعمال کی بازیابی کو ہی نہیں کہتے کیونکہ یہاں برے اعمال کی بازیابی (Return) کو بھی ثواب ہی کہا گیا ہے۔ لیکن ثواب زیادہ تر اچھے اعمال کے صلے کیلئے ہی استعمال ہوا ہے)۔

اب ایک قدم آگے بڑھیے

.....انسان نام ہے جسم اور روح کا

.....جسم کا تعلق دنیا سے ہے اور روح کا آخرت سے

.....جسم کی تعمیر و ترقی بھی ضروری ہے اور روح کی بھی

.....جسم کی تعمیر و ترقی ''کچھ لینے سے'' ہوتی ہے اور روح کی تعمیر و ترقی ''کچھ دینے سے''

(اس حوالے سے قل العفو کے عنوان میں بڑی تفصیل کے ساتھ بات ہو چکی ہے لیکن یہاں بھی) ایک مثال دیکھ لیجئے کہ آپ کے پاس پانی کا ایک ہی گلاس ہے، لیکن آپ کے علاوہ کسی اور کو بھی پیاس لگی ہوئی ہے۔ اب اگر یہ پانی (دوسرے شخص کو پلانے کے بجائے) آپ خود پی لیں گے تو آپ کے جسم میں تعمیر و ترقی پیدا ہوگی اور آپ کی دنیا اچھی ہو جائے گی۔ لیکن اگر یہ پانی آپ (خود پینے کے بجائے) دوسرے شخص کو پلا دیں گے تو آپ

کی روح کی پرورش ہوگی اور آپ کی آخرت اچھی ہو جائے گی۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ جو Investment جسمانی بقا کیلئے کی جائے، اس کا Return (ثواب) دنیا میں ملتا ہے۔ لیکن جو Investment روحانی بقا کیلئے کی جائے اس کا Return (ثواب) آخرت میں ملتا ہے۔

چنانچہ قرآن کہتا ہے کہ

.....جو شخص ثواب الدنیا (دنیا میں بازیابی) حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اسے ثواب الدنیا مل جائے گا اور جو شخص ثواب الاخرۃ (آخرت میں بازیابی) حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اسے ثواب الاخرۃ مل جائے گا (145/ال عمران)

.....خدا کے پاس ثواب الدنیا بھی موجود ہے اور ثواب الاخرۃ بھی (134/النسا)

.....اللہ کی راہ میں (یعنی نظام خداوندی کے قیام کے لئے) جہاد کرنے والوں کو ثواب الدنیا بھی ملتا ہے اور ثواب الاخرۃ بھی (148/ال عمران)

مومنین کو دنیا و آخرت دونوں کی خوشگواریاں نصیب ہوتی ہیں کیونکہ وہ جسم (اپنی فلاح و بہبود) اور روح (دوسروں کی فلاح و بہبود) دونوں کا خیال رکھتے ہیں لیکن اگر کسی ایک ہی کا خیال رکھنا ممکن ہو تو وہ روح (آخرت) کو جسم (دنیا) پر ترجیح دیتے ہیں (169/الاعراف نیز 3/ابراہیم، 38,39/والنزعت وغیرہ)۔ ثواب الاخرۃ کے سامنے ثواب الدنیا کی حیثیت کچھ بھی نہیں کہ آخرت کے سامنے دنیا کی مثال کھیل تماشے سے زیادہ نہیں (32/الانعام نیز دیکھئے 77/النساء، 21/بنی اسرائیل)

خدا کہتا ہے کہ

حکومت سب خدائے برحق کی ہے، اسی کا ثواب بہتر ہے اور اسی کا بدلہ اچھا ہے۔ اور (اے محمدؐ) ان سے دنیا کی مثال بیان کر دو (کہ وہ آخرت کے سامنے ایسی ہے) جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا تو اس کے ساتھ زمین کو روئیدگی مل گئی (اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہ ہمیشہ ایسی ہی رہے گی۔ لیکن پھر یہ ہوا کہ) سب کچھ سوکھ کر چورا چورا ہو گیا اور اسے ہوا کے جھونکوں نے ادھر اُدھر بکھیر دیا اور (وہ Investment جو روحانی بقا کے لئے کی گئی ہو یعنی) نیکیاں جو باقی رہنے والی ہیں وہ ثواب کے لحاظ سے تمہارے پروردگار کے ہاں بہت اچھی اور امید کے لحاظ سے بہت بہتر ہیں (44,45,46 / الکھف)

ثواب دنیا میں بھی محسوس شکل میں ملتا ہے اور آخرت میں بھی محسوس شکل میں ہی ملے گا۔ دنیا میں ثواب غلبہ و اقتدار، مال و دولت و اولاد وغیرہ کی صورت میں ملتا ہے (147,148 / ال عمران، 46 / الکھف وغیرہ) اور آخرت میں ثواب ان باغوں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (195,198 / ال عمران) اور دبیز و ریشمی ملبوسات اور سرفراری وسربلندی کی نشت گاہوں وغیرہ کی صورت میں ملے گا (31 / الکھف)

رہا سوال یہ کہ ثواب ملتا کس طرح ہے تو اس آیت پر دوبارہ توجہ دیجئے کہ

کافروں کے اعمال ہی ثواب بن کی ان کی طرف لوٹ آتے ہیں (36 / المطففین)

یعنی اعمال کے نتائج اعمال کے اندر ہی پوشیدہ ہوتے ہیں یا یوں کہیے کہ انسان کا

عمل اپنا صلہ آپ ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ خدا کے بنائے ہوئے قانون مکافاتِ عمل کے تحت ہر عمل از خود ایک خاص نتیجہ مرتب کر لیتا ہے۔ مثلاً دانت صاف کرنے کے عمل سے ثواب یہ ملتا ہے کہ دانت صاف ہو جاتے ہیں۔

اسی لیے کہا گیا کہ

انسان جو عمل کرے گا وہی اس کا بدلہ ہو گا 147 (/ الاعراف، 90 / النمل، 39 / الصفت وغیرہ وغیرہ)

اب تو آپ جان ہی چکے ہونگے کہ ثواب انسانی اعمال کی وہ 'فطری' بازیابی ہے جو ایک محسوس شکل میں دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت میں بھی ملے گی۔ مثلاً صحیح وقت پر صحیح دوائی کھانے کا ثواب صحت یابی ہے اور صحیح وقت پو صحیح ورزش کرنے کا ثواب تندرستی ہے۔

آب آیئے بڑے ملک کے قل اور اس کی روح کو ثواب پہنچانے کے معاملے کی طرف، تو آپ خود ہی سوچیے کہ کیا یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کے دوائی کھانے سے کسی دوسرے کی بیماری دور ہو جائے یا آپ کی ورزش کرنے سے کسی دوسرے کو تندرستی ملے؟

اسی لئے قرآن میں لکھا ہے کہ

.....اے اُن سے کہہ دو کہ مجھ کو میرے اعمال (کا ثواب ملے گا) اور تم کو تمہارے اعمال (کا)۔ تم میرے اعمال کے لئے جواب دہ نہیں ہو اور میں تمہارے اعمال کے لئے جواب دہ نہیں ہوں (41 / یونس، 54 / النور وغیرہ)

.....جو شخص پاک ہوتا ہے وہ اپنے ہی لئے پاک ہوتا ہے (18 / فاطر)

.....جو گمراہ ہوتا ہے تو گمراہی کا نقصان بھی اسی کو ہوتا ہے (15 / بنی

اسرائیل)

.....خدا کے حضور کوئی بھی کسی بھی دوسرے کے اعمال کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا (7/الزمر، 18/فاطر، 15/بنی اسرائیل وغیرہ)

.....خدا کے حضور کوئی بھی کسی کی بھی حمایت یا مدد نہیں کر سکتا۔ کہ وہاں نہ تو کسی کی سفارش سنی جاتی ہے نہ ہی کسی سے کوئی بدلہ قبول کیا جاتا ہے (48,123,254/البقرۃ)

چناچہ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ

.....لوگ اپنے اپنے اعمال پر اٹھائے جائیں گے (متفق علیہ)

.....ہر بندے کو اسی حالت پر اٹھایا جائے گا جس پر وہ فوت ہوا (مسلم)

.....تم میں سے ہر شخص کا اس طرح محاسبہ ہوگا کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی وکالت اور ترجمانی کرنے والا نہیں ہوگا۔ وہ (بندہ) اپنے دائیں طرف دیکھے گا تو اسے اپنے عمل کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا۔ پھر بائیں طرف دیکھے گا ادھر بھی سوائے اپنے اعمال کے کسی اور کو نہیں پائے گا (بخاری، مسلم، ترمذی)

.....میں تم سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ (حقوق میں خیانت کے باعث) وہ کہے کہ یا رسول اللہ میری داد (مدد) کے لیے پہنچئے اور میں کہوں کہ میں تیرے لیے اب کچھ نہیں کر سکتا۔ میں شریعت کے احکام تجھ تک پہنچا چکا (مسلم)

.....اے قریش کے لوگو! اللہ سے (نیک اعمال کر کے خود) اپنی نجات

مانگو۔ میں اللہ کے مقابلے میں تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکتا۔ اے (چچا) عباسؓ بن عبدالمطلب، اے (پھوپھی) صفیہؓ میں اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکتا۔ اے فاطمہؓ محمدؐ کی بیٹی تم جو چاہے مجھ سے مانگو مگر اللہ کے مقابلے میں تمہارے لئے میرے پاس کچھ نہیں (بخاری، مسلم)

آپ نے دیکھا کہ قرآن وسنت نے کتنے واضح الفاظ میں بار بار اس حقیقت کا اعلان کیا کہ ہر شخص اپنے کیے کا ذمہ دار خود ہے۔ یعنی ہر شخص کو ان ہی اعمال کی جزا ملے گی جو (کسی دوسرے نے نہیں بلکہ) اس نے خود کیے ہوں گے۔

امید ہے کہ اب نورا یہ بات بخوبی سمجھ چکا ہوگا کہ کسی دوسرے (زندہ یا مردہ) شخص کو اپنے اعمال کا ثواب پہنچانے کے عقیدے کی حقیقت کیا ہے اور اس پر یقین رکھنے کا انجام کیا ہوسکتا ہے؟

تقدیر

کیا آپ کے ذہن میں کبھی اسطرح کے سوال نہیں اٹھے کہ اگر وہی ہوتا ہے جو خدا کی طرف سے لکھا ہوتا ہے تو جو لوگ برائیاں کرتے ہیں اس میں اان کا کیا قصور؟اور جو لوگ اچھائیاں کرتے ہیں اس میں ان کا کیا کمال؟ کیا یہ ظلم نہیں کہ کچھ لوگوں کی قسمت میں گناہ اور کچھ کی قسمت میں ثواب لکھ کر انہیں دوزخ و جنت کا حقدار قرار دے دیا جائے؟ کیا خدا ظالم ہے؟

کیا قرآن میں بار بار لکھی ہوئی یہ بات (معاذ اللہ) درست نہیں کہ
خدا کبھی لوگوں پر ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں
(117/ال عمران، 70/التوبۃ، 44/یونس، 101/ھود، 33/
النحل،40/العنکبوت وغیرہ)؟

کیا یہ اور اس طرح کی درجنوں آیات بھی غلط ہیں کہ
.... جیسا کرو گے ویسا بھرو گے(82/التوبۃ)؟
.... تمہارا نصیب تمہارے اپنے اعمال سے مرتب ہوتا ہے(202/
البقرۃ)؟
.... انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے(39/النجم) وغیرہ
وغیرہ؟

اگر انسان اپنی مرضی سے کچھ کر ہی نہیں سکتا تو رشد و ہدایت کا جو سلسلہ انبیاء کرام کے ذریعے چلایا گیا، کیا وہ سراب ہے؟ کہ ایک طرف تو خدا انسان کو برائی سے بچنے کی تلقین

کرتا ہے اور یہ یقین بھی دلاتا ہے کہ وہ برائی سے بچ سکتا ہے لیکن دوسری طرف اسے برائی سے بچنے کا اختیار ہی نہیں دیتا؟

غور کیجئے کہ یہ تسلیم کر لینے سے بھی کہ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے، قرآن میں کتنے اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بات کئی مرتبہ لکھ دی گئی ہے کہ قرآن کے بقول قرآن میں تضاد کا مطلب یہ ہے کہ قرآن (نعوذ باللہ) اللہ کا کلام ہی نہیں (82/ النساء)؟

اس طرح کے سوال صرف اس انسان کے ذہن میں نہیں اٹھ سکتے جو عقل سے کام نہیں لیتا اور جو انسان عقل سے کام نہیں لیتا قرآن اسے انسانوں کے زمرے میں شمار ہی نہیں کرتا (44/الفرقان، 179/الاعراف)۔ آپ کے ذہن میں بھی یہ سوال ضرور اٹھے ہونگے لیکن پھر آپ کی توجہ ان ضعیف روایت کی جانب منتقل ہوگئی ہوگی جن کے مطابق حضور اکرمؐ نے تقدیر کے معاملے پر غور و فکر سے سخت الفاظ میں منع فرمایا ہے اور آپ ان سوالوں کو کچلنے پر مجبور ہو گئے ہونگے۔

یہ سب قرآن سے دوری کا نتیجہ ہے۔ ان آیات کی طرف آپ کی توجہ تفصیل کے ساتھ کئی مرتبہ مبذول کروائی جا چکی ہے کہ قرآن میں ایک طرف تو مومنین کی یہ خصوصیت بتائی گئی کہ

> یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو (اور تو اور) خدا کے احکام بھی غور و فکر کیے بغیر قبول و اختیار نہیں کرتے (73/الفرقان)۔

اور دوسری طرف یہ کہا گیا ہے کہ

> خدا کے نزدیک بدترین مخلوق وہ لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے (22/الانفال)۔

قرآن کا تو مرکز ومحور ہی دعوت فکر ہے۔ یہ آیت ایک مرتبہ پھر دیکھیے جس کا حوالہ ''صرف ایک بات'' کے عنوان میں بھی پیش کیا جا چکا ہے کہ

(اے محمدؐ) ان سے کہہ دو کہ میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ بات یہ ہے کہ تم عقل استعمال کیا کرو (46/سبا)۔

کیا اس بات کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ حضور اکرمؐ کسی بات پر غور وفکر کرنے سے منع فرمائیں جبکہ قرآن بات بات پر غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ حضور اکرمؐ نے تو فرمایا کہ

اللہ تعالیٰ نے جب عقل کو پیدا کیا تو اس سے فرمایا کہ میں نے کوئی مخلوق تجھ سے بہتر، افضل اور خوبصورت پیدا نہیں کی۔ میں تیرے سبب لوں گا، تیرے سبب دوں گا، تیرے سبب پہنچانا جاؤں گا، تیرے سبب ناراض ہوں گا، تیرے سبب ثواب ہوگا اور تجھ پر ہی عذاب ہوگا (مشکوۃ۔ کتاب الاذان)

آدمی نمازی، روزہ دار، زکوۃ دینے والا، حج اور عمرہ کرنے والا ہوتا ہے (یہاں تک کہ آپؐ نے سارے نیک کام گنائے) لیکن قیامت میں اسے اس کی عقل کے مطابق ہی جزا دی جائے گی (مشکوۃ۔ کتاب الاذان)

آپ کو یہ جان کر بڑی حیرت ہوگی کہ قرآن کے مطابق ''وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے'' کا بہانہ سب سے پہلے شیطان نے بنایا اور یہ کہا کہ

''(اے خدا) کہ تو نے مجھے گمراہ کیا'' (16/الاعراف، 39/الحجر)

میرا کوئی قصور نہیں کہ میں تو وہی کچھ کرتا ہوں جو تیری طرف سے لکھا ہوتا ہے۔

علامہ اقبال کے بقول شیطان کچھ اس طرح خدا سے مخاطب ہوا کہ

اے خدائے کن فکاں مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر
آہ وہ زندانیء نزدیک و دور و دیر و دود
حرفِ استکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا
ہاں مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود

اور خدا نے شیطان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دھتکار دیا (18/الاعراف، 34/الحجر) کیونکہ اپنی غلطی خدا کے ذمے ڈال کر وہ اپنی اصلاح کے امکان سے اتنی دور جا چکا تھا کہ جہاں سے اس کی واپسی ممکن نہیں تھی۔

علامہ اقبال کے الفاظ میں خدا نے فرشتوں سے شیطان کے بارے میں کہا کہ

پستیء فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے
کہتا ہے تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود
دے رہا ہے اپنی آزادی کو محکومی کا نام
ظالم اپنے شعلہء سوزاں کو خود کہتا ہے دود

شیطان کے بعد ''وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے'' کا بہانہ کفار و مشرکین نے بنایا۔ قرآن کہتا ہے کہ

جو لوگ شرک کرتے ہیں (اگر تم ان سے پوچھو کہ وہ شرک کیوں کرتے ہیں تو) وہ کہیں گے کہ اگر خدا کو منظور ہوتا تو نہ ہم شرک کرتے نہ ہمارے آباء واجداد (148/الانعام)۔ (ہم تو وہی کرتے ہیں جو خدا نے ہماری قسمت میں لکھا ہوا ہے) اگر خدا کی مرضی ہوتی تو ہم ان (بتوں) کو نہیں پوجتے (20/الزخرف)۔

قرآن کے بقول کفار اپنی دولت غریبوں پر خرچ نہ کرنے کے جواز میں بھی یہی دلیل دیا کرتے تھے کہ

اگر خدا کو منظور ہوتا تو وہ خود انہیں کھانا کھلا دیتا (47/یس)

اور ان سب باتوں کے جواب میں خدا کہتا ہے کہ

یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں وہ سراسر جہالت، حماقت، قیاس آرائی اور گمراہی ہے (148/الانعام، 20/الزخرف، 47/یس)

کفار و مشرکین کے بعد ''وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے'' کا بہانہ مسلمانوں نے بنایا اور اتنا بنایا کہ اسے اپنا نصب العین ہی بنالیا۔ علامہ اقبال کے بقول

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

تقدیر کا قرآنی مفہوم سمجھنے سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ تقدیر (ق۔د۔ر) کے لغوی معنی ہیں اندازہ اور پیمانہ (تاج العروس)۔ قرآن کہتا ہے کہ

خدا وہ ہے جو ہر شے کو تخلیق کرتا ہے۔ پھر اس میں مناسب اعتدال پیدا کر دیتا ہے۔ پھر اس کے لئے اندازہ اور پیمانہ مقرر کر دیتا ہے (یعنی اس میں ایک خاص حد تک بڑھنے، پھولنے اور پھلنے کی صلاحیت رکھ دیتا ہے یہی اس شے کی تقدیر ہوتی ہے)۔ پھر اسکی رہنمائی اس راستے (یعنی دین) کی طرف کر دیتا ہے جس پر چل کر وہ اپنے لیے مقرر کئے گئے اندازے اور پیمانے (یعنی اپنی تقدیر) کے مطابق بن جاتی ہے'' (1,2/الاعلیٰ)۔

یہ رہنمائی تمام مخلوقات کی طرف وحی کی جاتی ہے کہ

.... یہ رہنمائی انبیائے کرام کی طرف وحی کی گئی (163/النساء)

.... یہ رہنمائی فرشتوں کی طرف وحی کی گئی (12/الانفال)

.... یہ رہنمائی اجرام فلکی کی طرف وحی کی گئی (12/حم السجدۃ)

.... یہ رہنمائی زمین کی طرف وحی کی گئی (5/الزلزال)

.... یہ رہنمائی شہد کی مکھی کی طرف وحی کی گئی (68/النحل) وغیرہ وغیرہ۔

لیکن دیگر مخلوقات اور انسان میں فرق یہ ہے کہ دیگر مخلوقات اس رہنمائی کی اطاعت پر مجبور ہیں جبکہ انسان اس رہنمائی کی اطاعت پر مجبور نہیں۔ دیگر مخلوقات اسلئے مجبور ہیں کہ خدا نے اپنی رہنمائی انکے اندر رکھ دی ہے۔ اسی کو ان مخلوقات کی فطرت یا جبلت کہتے ہیں۔ قرآن کے بقول

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ طوعاً و کرعاً خدا کی فرمانبراری کرتا ہے (83/ال عمران، 15/الرعد، 18/الحج، 1/الحدید، 1/الحشر، 49/النحل وغیرہ)۔ وہ اسطرح کہ ''یفعلون ما یومرون'' یعنی انہیں جو کچھ حکم دیا جاتا ہے وہ اسکی تعمیل کرتے ہیں (50/النحل) ''وھم لایستکبرون'' یعنی انہیں اس بات کا اختیار ہی نہیں دیا گیا کہ وہ احکام الٰہی سے سرکشی برتیں (49/النحل)

اور انسان اسلئے مجبور نہیں کہ خدا نے اپنی رہنمائی اس کے اندر نہیں رکھی بلکہ اسے خارج سے (یعنی انبیاء کرام کے ذریعے) عطا کی۔ اسی لئے انسان کی کوئی فطرت یا جبلت نہیں قرآن کے بقول

خدا نے انسان کو دیکھنے سننے (یعنی سوچنے سمجھنے) کی صلاحیت دی اور

اسے درست راستہ دکھا دیا۔ اب انسان کا جی چاہے تو وہ اس راستے کو اختیار کر لے اور اس کا جی چاہے تو اس راستے سے انکار کر لے (2,3/الدھر) جس کا جی چاہے وہ آگے بڑھ جائے جس کا جی چاہے وہ پیچھے رہ جائے کہ انسان پر اپنے اعمال کے سوا کوئی بندھن نہیں (37,38/المدثر)

اقبال کے بقول

تو اپنی سر نوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامہ ء حق نے تری جبیں

کیا آپ نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ حیوان پیدائشی طور پر اس روش سے آگاہ بھی ہوتا ہے اور اس پر گامزن بھی جس پر اسے ساری زندگی چلنا ہوتا ہے لیکن انسان کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر بطخ کا بچہ پیدائشی طور پر تیراک ہوتا ہے لیکن انسان کے بچے کو تیراکی سیکھنی پڑتی ہے۔ گائے کا بچہ بھوک سے مر جائے گا لیکن گوشت نہیں کھائے گا جبکہ انسان کا بچہ بھوک میں کچھ بھی کھا لیتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ انسان کا بچہ انسانوں سے دور حیوانوں میں پروان چڑھے تو وہ حیوانوں جیسا بن جائے گا لیکن حیوان کا بچہ حیوانوں سے دور انسانوں میں پروان چڑھ کر انسانوں جیسا نہیں بن سکتا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ حیوان اپنی فطرت یا جبلت کے ہاتھوں احکامِ الٰہی کی پیروی پر مجبور ہے جبکہ انسان کی کوئی فطرت نہیں کیونکہ انسان صاحب ارادہ واختیار ہے۔

کیا آپ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ

.... اگر انسان کو اپنے فیصلے خود نہیں کرنے ہوتے تو خدا اسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی کیوں دیتا؟

.... اگر انسان اپنی مرضی کا مالک خود نہ ہوتا تو اسے اپنے اعمال کا حساب کیوں دینا پڑتا (23/المومنون، 93/النحل، 39/النور، 113/الشعراء وغیرہ)؟

.... اگر انسان صاحب ارادہ واختیار نہیں ہوتا تو کیا خدا یہ کہتا کہ جو غلطی مجبوری یا بھول چوک سے ہو جائے اس پر مواخذہ نہیں۔ مواخذہ صرف اس غلطی پر ہوگا جس میں ارادہ و اختیار شامل ہو (5/ الاحزاب، 106/النحل)؟

یہاں آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر انسان کی کوئی فطرت یا جبلت نہیں تو پھر انسان کا بچہ پیدا ہوتے ہی اپنی ماں کے دودھ کی طرف کیوں مائل ہوتا ہے؟ تو بات یہ ہے کہ اس معاملے کا تعلق انسان کی طبیعی (یعنی حیوانی سطح کی) زندگی سے ہے۔ اور طبیعی زندگی میں انسان بھی دیگر جانداروں کی طرح احکام الٰہی کی پیروی پر مجبور ہے۔ کہ انسان کو بھی دیگر جانداروں کی طرح ازخود (یعنی کسی ارادہ واختیار کے بغیر) بھوک، پیاس وغیرہ لگتی ہے۔ لیکن یہاں بات انسانی جسم کی نہیں بلکہ انسانی ذات کی ہو رہی ہے۔ انسانی جسم تو یوں بھی انسانی ذات (یعنی روح) کی ایک عارضی سی قیام گاہ ہے۔

کاش مسلمانوں کو جس طرح بات بات پر اسلاف کی روایات یاد آتی ہیں اس طرح اللہ کی آیات بھی یاد آتیں۔ تو انہیں یہ آیت بھی یاد آتی کہ

بعض لوگ بیہودہ حکایات کے خریدار ہوتے ہیں تا کہ (وہ انکے ذریعے) لوگوں کو اللہ کی راہ سے بلا علم بھٹکا دیں اور اسکا مذاق بنا دیں یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے (6/ لقمان)

اور یہ آیات بھی یاد آتیں کہ

.... قرآن برحق ہے (31/فاطر)

.... یہ کتاب ہر قسم کے شک وشبہے سے پاک ہے (2/البقرۃ)

اور یہ بھی یاد آتا کہ آدم اور آدم کی بیوی نے اپنی غلطی کے جواز میں شیطان کی طرح تقدیر کا بہانہ نہیں بنایا تھا بلکہ یہ کہا تھا کہ

اے ہمارے رب ہم نے اپنے آپ پر ظلم کرلیا ہے (یعنی ہم جانتے ہیں کہ یہ ہماری اپنی غلطی ہے) اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم خسارا پانے والوں میں سے ہو جائیں گے (23/الاعراف)

اپنی غلطی کے اعتراف سے ان کی اصلاح کا امکان روشن ہو گیا اور خدا نے کہا کہ

ہم تمہاری طرف ہدایت بھیجتے رہیں گے (38/البقرۃ) جس کا جی چاہے اسے اختیار کرلے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے (29/الکھف) لیکن اسے اختیار کرنے والے کو جنت ملے گی (82 البقرۃ) اور اس سے انکار کرنے والا جہنم میں جائے گا (81/البقرۃ)

یعنی خدا نے یہ تو نہیں لکھا کہ انسان احکام الٰہی کی پیروی کرے گا یا نہیں کرے گا لیکن یہ ضرور لکھا ہے کہ اگر انسان نے احکام الٰہی کی پیروی کی تو کیا ہوگا اور اگر نہیں کی تو کیا ہوگا۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ خدا نے اس بات کا اندازہ اور پیمانہ تو مقرر نہیں کیا کہ انسان کونسا عمل کرے گا لیکن اس بات کا اندازہ اور پیمانہ ضرور مقرر کیا ہے کہ اس کے کونسے عمل سے کونسا نتیجہ مرتب ہوگا۔ اور یہی ہے تقدیر کا قرآنی مفہوم۔

قرآن کہتا ہے کہ

....جب انہوں نے ٹیڑھا راستہ اختیار کیا تو خدا نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا (5/الصّف)

....درست راستے سے اسی کو پھیرا (یعنی بھٹکایا) جاتا ہے جو خود اس سے پھر (یعنی بھٹک) جاتا ہے (9/الذریت)

....انسان جیسا عمل کرتا ہے اسے ویسا ہی بدلہ ملتا ہے (147/ الاعراف)۔

یعنی انسان جیسا خود بن جاتا ہے ویسی ہی اس کی تقدیر بھی بن جاتی ہے۔اس حقیقت کو حضرت عمرؓ کے ایک واقعہ سے سمجھنا بالکل ہی آسان ہے کہ

(ایک مرتبہ ملک شام کی طرف جاتے ہوئے حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ وہاں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔اس پر حضرت عمرؓ نے شام جانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے واپسی کا اعلان کر دیا تو) حضرت ابو عبیدہؓ نے کہا کہ کیا آپ خدا کی تقدیر سے بھاگنا چاہتے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ ہاں میں خدا کی (ایک) تقدیر سے بھاگ کر (دوسری) تقدیر کی طرف جانا چاہتا ہوں (یعنی طاعون سے متاثرہ علاقے میں جا کر طاعون کا شکار ہونا بھی خدا کی تقدیر ہے اور وہاں نہ جا کر طاعون سے محفوظ رہنا بھی خدا کی تقدیر کے مطابق ہی ہوگا)۔یہ گفتگو جاری تھی کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف آ گئے جو کسی ضرورت سے باہر گئے ہوئے تھے۔انہوں نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا کہ اس مسئلہ کی بابت مجھے کچھ علم ہے، میں نے حضور اکرمؐ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جہاں وبا کی خبر سنو وہاں نہ جاؤ (مسلم)

حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ

دعا تقدیر کو پھیرتی ہے (ترمذی)

اس جلیل القدر حدیثِ نبوی اور حضرت عمرؓ کے واقعہ کو ایک ساتھ پڑھنے سے تقدیر کا درست مفہوم سمجھے کے علاوہ دعا کا درست مفہوم بھی سہولت سے سمجھا جا سکتا ہے کہ دعا کے معنی فقط ہاتھ اٹھا کر کسی شے کی آرزو کرنا نہیں ہوتے، اس شے کے حصول کی عملی کوشش بھی دعا میں شامل ہوتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے طاعون سے بچنے کی دعا یوں کی کہ طاعون زدہ علاقے سے واپسی اختیار کر لی اور ان کی اس دعا نے ان کی تقدیر کو یوں پھیر دیا کہ وہ طاعون سے متاثر نہیں ہوئے۔ ورنہ اگر وہ طاعون سے بچنے کی دعا (طاعون زدہ علاقے سے واپسی اختیار) نہ کرتے تو ان کی تقدیر نہ بدلتی اور وہ طاعون میں مبتلا ہو جاتے۔

اقبال نے کیا خوب کہا کہ

اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر
تو مسلماں ہے تو تقدیر ہے تدبیر تری

....

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

اس بات میں شک و شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ انسان کا نصیب خدا نہیں لکھتا بلکہ انسان خود لکھتا ہے۔ اسی لیے تو حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ

جو کوئی قسمت کا حال بتانے والے کے پاس جاتا ہے اور اس کے کہنے پر یقین کرتا ہے وہ اس پیغام سے انکار کرتا ہے جو محمدؐ پر نازل ہوا (ابو داؤد)

علامہ اقبالؒ پوچھتے ہیں کہ

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوہء تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

....

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

آپ سمجھ ہی چکے ہوں گے کہ یہ بہانہ کہ (انسان اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرسکتا بلکہ) وہی کچھ کرتا ہے جو خدا کی طرف سے لکھا ہوتا ہے دراصل اس روش کی پیروی ہے جس پر ابلیس چلا اور ظاہر ہے کہ اس روش پر چلنے کا انجام وہی ہوسکتا ہے جو ابلیس کا ہوا یا ہونا ہے۔

طلاق اور حلالہ

اس کا بھائی اپنے ذمے واجب الادا قرض بروقت ادا نہ کر سکا اور اس کی بیوی پر ''تین طلاق'' واقع ہوگئی کیونکہ بھائی کی ضمانت میں اس سے بیوی کیلئے ''تین طلاق'' لکھوا لی گئی تھی ورنہ میاں بیوی ایک دوسرے سے اتنی محبت کرتے تھے کہ طلاق کا تصور بھی محال تھا۔ دوبارہ شادی کے لیے مولوی صاحب کے بقول ''حلالہ'' ضروری ہے کہ ان کے بقول یہی اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی بیوی کو اس کے ساتھ دوبارہ نکاح کرنے سے پہلے کسی دوسرے مرد سے نکاح کر کے کم از کم ایک مباشرت کے بعد طلاق لینی ہوگی۔

کیا اذیت ناک صورتحال ہے کہ زندگی بھر کی جدائی کے خیال سے جان نکلتی ہے، حلالہ غیرت کو گوارا نہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کا سوچا بھی نہیں جا سکتا؟ لیکن اس اذیت ناک صورتحال سے دوچار ہونے والا وہ پہلا شخص نہیں کہ یہ زہر آج تک نجانے کتنے ہی لوگوں کو پینا پڑا؟ تاریخ گواہ ہے کہ دور ملوکیت کے بادشاہوں نے اپنی حکومت کی بیعت میں یہ شرط شامل کر رکھی تھی کہ بیعت کرنے والا اگر بیعت سے ہٹ گیا تو اس کی بیوی پر فوراً تین طلاق واقع ہو جائے گی۔ اس بیعت نامے کو زیادہ سے زیادہ سودمند بنانے کے لیے ضروری تھا کہ اسے موثر سے موثر تر بنایا جائے۔ چنانچہ ایک مجلس میں تین طلاق کے رواج کی بھی خوب حوصلہ افزائی کی جاتی رہی۔

جہاں تک طلاق کے بارے میں قرآنی نکتہ نظر کا تعلق ہے تو اس پر گفتگو سے پہلے

یہ جان لیجئے کہ قرآن کریم میں اکثر احکام بطور اصول مذکور ہیں یعنی ان کی تفاصیل طے نہیں کی گئیں لیکن عائلی زندگی کے متعلق احکام کی تفاصیل بھی طے کر دی گئی ہیں۔ عائلی زندگی کو اس قدر اہمیت اس لئے دی گئی کہ اسے امن واطمینان کا گہوارہ بنائے بغیر اسلامی معاشرے کا قیام ممکن ہی نہیں اور عائلی زندگی میں نکاح کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی جیسی ہوتی ہے جسے توڑنا بچوں کا کھیل نہیں۔

نکاح عربی زبان کا لفظ ہے جسکے لغوی معنی ایک دوسرے میں یوں گھلنے ملنے کے ہیں جسطرح آنکھوں میں نیند گھلتی ہے (نکع النعاس عینه) یا جسطرح زمین میں بارش کی بوندیں جذب ہوتی ہیں (نکع المطر الارض)۔

قرآن کریم کی رو سے

نکاح ایک مضبوط معاہدہ ہے (21/النساء) اور معاہدے کے لئے فریقین کا بالغ ہونا ضروری ہوتا ہے۔ لہذا بلوغت یا جوانی کو ہی نکاح کی عمر کہا گیا (6/النساء، 34/بنی اسرائیل) اس مضبوط معاہدے کا مقصد محض جنسی ملاپ نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے مقرر کردہ حقوق و فرائض کی پاسداری ہے (24/النساء) اور نکاح سے مرد اور عورت دونوں پر یکساں حقوق وفرائض عائد ہو جاتے ہیں (228/البقرۃ) اسی لیے میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا گیا (187/البقرۃ) یعنی وہ ایک دوسرے کے حیادار بھی ہیں اور راز دار بھی۔ جوڑے بنائے ہی اسی لئے جاتے ہیں کہ ان سے تسکین حاصل ہو اور محبت اور رحمت کی فضا جنم لے (21/ الروم) چناچہ کہا گیا کہ مرد بھی اپنی پسند کی عورتوں سے نکاح کریں (3/النساء) اور عورتیں

بھی اپنی پسند کے مردوں سے نکاح کریں (19/النساء)۔

غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے نکاح کو کتنے شاندار مقاصد اور کتنی جاندار شرائط سے منسوب کیا؟ اسی لئے تو حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ

''اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں ناپسندیدہ ترین چیز طلاق ہے'' اور ''تم میں بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں کے ساتھ بہتر ہے (ابنِ ماجہ)

آپؐ کے فرامین کی تصدیق قرآن کے اس حکم سے بھی ہوتی ہے کہ

ان (یعنی بیویوں) کے ساتھ اچھے سلوک سے رہو چاہے وہ تمہیں ناپسند ہی کیوں نہ ہوں، ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس میں بہت بھلائی رکھ دے (19/النساء)

یعنی بیوی کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہو جائیں تو خاوند کو سب سے پہلے دل کی گہرائی سے مفاہمت پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی ہوگی چاہے یہ اسکی طبیعت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، پھر بھی حالات ٹھیک نہ ہوں تو وہ طلاق کا حق استعمال کرسکتا ہے لیکن قرآن نے طلاق کا حق صرف مرد کو ہی نہیں دیا بلکہ عورت کو بھی دیا ہے۔

قرآن کے بقول

''اور اگر کسی عورت کو اپنے خاوند کی طرف سے زیادتی یا بے رغبتی کا اندیشہ ہو تو میاں بیوی پر کچھ گناہ نہیں کہ وہ کسی قرارداد پر صلح کر لیں ..... اور اگر میاں بیوی میں موافقت نہ ہو سکے اور وہ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو خدا ہر ایک کو اپنی دولت سے غنی کر دے گا (یعنی تم اس علیحدگی سے اس لیے نہ رکے رہو کہ اس سے معاشی

دشواریاں پیدا ہو جائیں گی ۔ یہ ذمہ خدا کے نظام پر ہے کہ وہ اپنے وسیع ذرائع سے تم دونوں کو ضروریاتِ زندگی کا سامان بہم پہنچائے کہ اس کے نظام کی بنیاد ہی وسعت و حکمت پر ہے) خدا وسعت والا ہے ،حکمت والا ہے‘‘(130-128/النساء)

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ

حضورؐ نے ہمیں علیحدگی کا اختیار دے دیا تھا (مسلم)

اس باب میں علامہ اقبال مشہور ترک شاعر ضیا کے نظریات پر تبصرہ کرتے ہوئے (اسلام میں افکار الٰہیہ کی تشکیلِ نو میں) لکھتے ہیں کہ

’’میں پوچھتا ہوں کہ جن مساوات کا اظہار ضیا نے کیا ہے یعنی طلاق، علیحدگی اور وراثت میں مساوات، کیا وہ شریعتِ محمدی کی رو سے بھی ممکن ہے؟ میں نہیں جانتا کہ کیا ترکی میں عورتوں کی بیداری نے ایسے مطالبات پیدا کر دیے ہیں جو بنیادی اصولوں کی ازسرِ نو تفسیر کے بغیر پورے نہیں ہو سکتے لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ پنجاب میں ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں کہ جب وہ مسلمان عورتیں جو اپنے غیر پسندیدہ شوہروں سے نجات پانا چاہتی تھیں، اپنا مذہب ترک کرنے پر مجبور ہوئیں ۔ یہ صورتحال ایک تبلیغی مذہب کے مقاصد کے ساتھ قطعی ہم آہنگ نہیں..... جہاں ترک شاعر کے مطالبات کا تعلق ہے تو غالباً اسلام کے خاندانی نظام سے متعلق اس کی واقفیت زیادہ نہیں، نہ ہی غالباً وہ وراثت کے قرآنی احکام کی اقتصادی اہمیت کو سمجھتا ہے (اقبال اور عورت صفحہ 119)

''اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسلام میں عورت کو (مرد کی طرح) طلاق دینے کا حق نہیں؟ جو حل اسلام نے اس مسئلہ کا تجویز کیا ہے وہ نہایت عمیق تجربے پر مبنی ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ ہمارے علماء نے کبھی اس بات کی طرف توضیح ہی نہیں کی کہ نکاح کے وقت عورت کہہ سکتی ہے کہ جو حق اسلام نے طلاق کا تم کو دیا ہے وہی اس وقت مجھے دو تو پھر نکاح ہوگا'' (اقبال اور عورت صفحہ 91)

اگر قرآن نے مرد کی طرح عورت کو بھی طلاق کا حق نہ دیا ہوتا تو وہ یہ کیوں کہتا کہ جب مرد نباہ چاہے اور عورت طلاق تو عورت کو اپنے مہر کا کچھ حصہ بطور ہرجانہ ادا کرنا ہوگا (229/البقرۃ) اور دوسری صورت میں کہ جب عورت نباہ چاہے اور مرد طلاق تو مہر (چاہے سونے کا ڈھیر ہی کیوں نہ ہو) میں سے کچھ واپس نہیں لیا جا سکتا (20/النساء)؟

قرآن کے الفاظ میں کچھ اس طرح کہ

اگر عورت خاوند کے ہاتھ سے رہائی پانے کے بدلے کچھ دے ڈالے تو دونوں پر کچھ گناہ نہیں (229/البقرۃ)

اور اگر تم ایک عورت کو چھوڑ کر دوسری عورت سے شادی کرنا چاہو اور پہلی عورت کو بہت سا سامان دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ (واپس) نہیں لینا (20/النسا)

بہر طور طلاق (یعنی نکاح کے معاہدے کی منسوخی) کی کاروائی خواہ مرد چاہے خواہ عورت، عدالت میں ہی ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ طلاق کے آغاز میں طلاق دینے کا حکم میاں بیوی کو نہیں دیا گیا بلکہ حضور اکرمؐ کو دیا گیا کیونکہ آپؐ اسلامی مملکت کے چیف جسٹس تھے، کہا گیا کہ

اے نبیؐ جب تم عورتوں کو طلاق دو..... (1/الطلاق)

ظاہر ہے کہ یہ حکم طلاق کے مقدمات میں فیصلہ دینے کا ہے ورنہ آپؐ نے ازواج مطہرات میں سے تو کسی کو طلاق نہیں دی۔ بات یہ ہے کہ طلاق کے مقدمات فیصلے کے لئے آپؐ کی عدالت میں پیش کیے جاتے تھے کیونکہ مسلمانوں کو اپنے تنازعات میں آپؐ کو منصف بنانے کا حکم تھا (65/النساء) جبکہ آپؐ کی غیر موجودگی میں منصفی کے یہ فرائض ماتحت افسران/عدالتوں کے سپرد تھے جنہیں قرآن ''اولی الامر منکم'' کہتا ہے (59/النساء)۔

جو لوگ یہ مانتے ہیں کہ شوہر اپنی بیوی کی مرضی کے بغیر بھی اسے طلاق دے سکتا ہے، وہ اپنے آپ سے یہ سیدھا سادہ سا سوال کیوں نہیں پوچھتے کہ اگر کوئی مرد کسی عورت سے نکاح کا معاہدہ کرنا چاہے لیکن عورت نہ کرنا چاہے تو کیا یہ معاہدہ ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں ہو سکتا تو پھر مرد اس معاہدے کو اپنے طور پر توڑ کیسے سکتا ہے؟

طلاق کے لیے عدالت سے رجوع کرنا اس لیے ضروری ہے کہ نکاح کا معاہدہ میاں بیوی کی باہمی رضامندی سے ہوتا ہے لہذا کسی ایک کو اپنے طور پر ہی اسے منسوخ کرنے کا اختیار نہیں دیا جا سکتا، دونوں فریقین کے حقوق کا تحفظ ضروری ہے اور یہ کام عدالت ہی درست طور پر کر سکتی ہے۔ اور عدالت سے کہا گیا کہ

> ''اگر تمہیں میاں بیوی میں باہمی اختلاف کا اندیشہ ہو تو ایک ثالث شوہر کے کنبے سے اور ایک ثالث بیوی کے کنبے سے مقرر کرو۔ ان ثالثوں کی کوشش تہہ دل سے یہ ہونی چاہئے کہ میاں بیوی میں مصالحت کروائیں اور اگر انہوں نے ایسا کیا تو اللہ (کا قانون) میاں بیوی میں موافقت پیدا کر دے گا'' (35/النساء) (اس آیت میں ''اگر تمہیں اندیشہ ہو'' اور ''تم ثالث مقرر کرو'' کا تخاطب بھی

ظاہر ہے کہ عدالت ہی کی طرف ہے)

اگر ثالث بھی صلح کروانے میں ناکام ہو جائیں تو عدالت علیحدگی (نکاح کی منسوخی) کا حکم صادر کر دے گی لیکن یہ حکم ایسے وقت میں صادر کیا جائے گا کہ جہاں سے عدت کے عرصے کا حساب رکھا جا سکے (1 الطلاق)۔ اسے کہتے ہیں قرآن کی رو سے طلاق جس تک پہنچنے کیلئے ان سب مراحل سے گزرنا ضروری ہے جس کا ذکر کیا گیا بصورت دیگر طلاق ہو ہی نہیں سکتی۔

یہاں یہ بات بھی جان لینی چاہئے کہ قرآن کی رو سے طلاق کی ایک ہی قسم ہے۔ طلاق کی دیگر قسمیں (بائن، رجعی وغیرہ وغیرہ) دور ملوکیت میں خاص مقاصد کے تحت ایجاد کی یا کروائی گئیں۔ طلاق کئی قسموں کی ہو ہی کیسے سکتی ہے جبکہ نکاح ایک ہی قسم کا ہوتا ہے؟

بہر طور طلاق کا حکم صادر ہونے کے بعد عدت کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے جو ان عورتوں کے لئے جنہیں حیض آتا ہو، تین حیض کا عرصہ ہے (228/البقرۃ) ان عورتوں کے لئے جنہیں (بڑھاپے یا بیماری کی وجہ سے) حیض نہ آ سکتا ہو تین ماہ کا عرصہ ہے (4/الطلاق) اور ان عورتوں کے لئے جو حاملہ ہوں بچے کی پیدائش تک کا عرصہ ہے (4/الطلاق)۔

عدت کا مقصد یہ ہے کہ اگر مطلقہ عورت سابقہ شوہر سے حاملہ ہو گئی ہو تو اس کا پتہ چل جائے۔ اس لئے جن عورتوں کو ''ہاتھ لگانے سے قبل'' طلاق دے دی جائے انکی کوئی عدت نہیں (49/الاحزاب)۔ لہذا عدت اس عرصے کو کہتے ہیں جس کے دوران مطلقہ عورت کسی دوسرے مرد کے ساتھ نکاح نہیں کر سکتی لیکن سابقہ خاوند سے نکاح کر سکتی ہے بشرطیکہ سابقہ خاوند اصلاح کا ارادہ رکھتا ہو (228/البقرۃ)۔ عدت کے خاتمے پر ''دو عادل گواہوں'' کی موجودگی ضروری ہے (2/الطلاق) تا کہ اس بات کا اعلان ہو جائے کہ مطلقہ

عورت نئے نکاح کے لئے آزاد ہے۔

عدت پوری ہونے کے بعد بھی مطلقہ عورت کسی رکاوٹ کے بغیر سابقہ شوہر سے نکاح کر سکتی ہے۔اس بارے میں قرآن بڑا واضع حکم دیتا ہے کہ

''جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو اور انکی عدت پوری ہو جائے تو انہیں شوہروں کے ساتھ باہمی رضا و رغبت سے نکاح کرنے سے مت روکو''(232/البقرۃ)۔

اس آیہ مبارکہ میں 'شوہروں' سے مراد ظاہر ہے کہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں جنہوں نے طلاق دی ہے ورنہ جن لوگوں سے نکاح ابھی ہوا ہی نہیں انہیں شوہر کہہ کر پکارنا بڑی بے معنی سی بات ہے؟ اور یہ معاملہ بھی کچھ اور نکھر کر سامنے آتا ہے کہ طلاق دینا شوہر کا کام نہیں بلکہ عدالت کا کام ہے کیونکہ پہلے کہا گیا کہ ''جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو' اور پھر کہا گیا کہ ''انہیں شوہروں کے ساتھ باہمی رضا و رغبت کے ساتھ نکاح کرنے سے مت روکو''، تو کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ جس نے طلاق دی ہو اسی سے کہا جائے مطلقہ کو دوبارہ اپنے ساتھ شادی کرنے سے مت روکو؟ طلاق دو اور مت روکو کا تخاطب عدالت کے علاوہ اور کس کی طرف ہو سکتا ہے؟

بہر طور اگر دوبارہ نکاح کے بعد حالات ایک بار پھر باہمی اختلاف کا شکار ہو جائیں تو دوسری بار بھی پہلے کی طرح باہمی طلاق ہو سکتی ہے جسکے بعد عدت کے دوران یا عدت کے بعد تیسری بار بھی بغیر کسی رکاوٹ کے مطلقہ عورت سابقہ خاوند سے نکاح کر سکتی ہے کیونکہ

''طلاق دو بار ایسی ہوتی ہے کہ اس میں چاہے معروف طریقے سے (یعنی نکاح کر کے) عورت کو رکھ لیا جائے یا حسن سلوک سے رخصت

کر دیا جائے'' (229/البقرۃ)

لیکن ''اگر میاں بیوی میں (تین بار نکاح کے بعد) تین بار طلاق ہو جائے تو انکا نکاح ایک دوسرے کے ساتھ جائز نہیں البتہ اگر مطلقہ عورت کسی دوسرے مرد کے ساتھ نکاح کر لے اور وہ بھی اسے طلاق دے دے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ پھر نکاح کر لیں بشرطیکہ انہیں یقین ہو کہ وہ اللہ کی حدوں کو قائم رکھیں گے'' (230/البقرۃ)۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ نکاح اور طلاق ہر بار قرآنی احکام (جو بیان کر دیئے گئے ہیں) کے مطابق ہی ہو سکتے ہیں۔

یہ ہے قرآن کے مطابق ''تین طلاق'' کا مفہوم (پاکستان میں نافذ عائلی قوانین کے تحت بھی تین طلاق کا یہی مطلب ہے) لیکن قرآن سے تو مسلمانوں کی اکثریت دور بلکہ بہت دور ہے کیونکہ یہ لوگ ''خدا پرست'' نہیں بلکہ ''روایت پرست'' ہیں اور روایات کی رو سے ''تین طلاق'' کے معنی ہیں ایک دو یا تین مجلسوں میں طلاق کا لفظ تین بار ادا کرنا۔

کوئی یہ بھی نہیں سوچتا کہ مروجہ تین طلاقوں میں تو صرف ایک عدت پوری کی جاتی ہے جس کے بعد مطلقہ عورت عام حالات میں سابقہ شوہر کے لئے جائز نہیں رہتی؟ تین طلاق کے اس مفہوم کو اگر درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر وہ کونسی عدت ہے جس کے بعد قرآن کے بقول مطلقہ عورت کو سابقہ شوہر کے ساتھ نکاح کرنے سے نہیں روکنا چاہئے (232/البقرۃ)۔

قرآن کی رو سے نکاح مضبوط معاہدے کو کہتے ہیں (21/النساء) جو عورت اور مرد کے درمیان خدا کی طرف سے عائد کردہ (ایک دوسرے کے) حقوق و فرائض کی

پاسداری کے لئے کیا جاتا ہے (24/النساء) اور جس کے بعد مرد اور عورت ایک دوسرے کا لباس بن جاتے ہیں (187/البقرۃ) تو آپ خود ہی فرمایئے کہ

.... کیا ایک لباس کو ایک بار پہن کر تین بار اتارا جا سکتا ہے؟

....اور کیا ایک معاہدے کو ایک بار طے کر کے تین بار منسوخ کیا جا سکتا ہے؟

.... تو پھر ایک ہی نکاح کے بعد تین طلاقیں کس طرح ہو سکتی ہیں؟

قرآن کی رو سے تین نکاحوں کے بعد ہی تین طلاقیں ہو سکتی ہیں کہ ایک معاہدے کو ایک بار طے کر کے ایک ہی بار منسوخ کیا جا سکتا ہے اور ایک لباس کو ایک بار پہن کر ایک ہی بار اتارا جا سکتا ہے۔

یہاں ذرا ان شاندار مقاصد اور ان جاندار شرائط کو ذہن میں لایئے جن سے قرآن نے نکاح کو منسوب کیا اور سوچیے کہ جس نکاح کو خود اللہ تعالیٰ نے ''مضبوط معاہدہ'' کہا ہے اسے ہماری فرسودہ روایات نے کتنا کمزور کر دیا ہے کہ وہ طلاق کا لفظ (ایک سانس میں بھی) تین بار ادا کر دینے سے ٹوٹ جاتا ہے؟

ظلم کی انتہا دیکھئے کہ اس قسم کی طلاق کو بیک وقت جائز بھی تسلیم کیا جاتا ہے اور بدعت بھی کہا جاتا ہے؟ جبکہ بدعت اس چیز کو کہتے ہیں جو قرآن و حدیث کے خلاف ہو؟ تو کیا کسی ایسی چیز کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے جو قرآن و سنت کے خلاف ہو؟

جہاں تک ''حلالہ'' (یعنی منسوخ شدہ نکاح کی تجدید کے جواز کے لئے مطلقہ عورت کا ایک عارضی نکاح) کرنے یا کرانے کا تعلق ہے تو آپ خود ہی سوچیے کہ قرآن کے ساتھ اس سے سنگین مذاق اور کیا ہو سکتا ہے؟

یہ بات کبھی ایک لمحے کے لئے بھی نہیں بھولنی چاہئے کہ قرآن کریم کی جس آیت

(230/البقرۃ) کو ''حلالہ'' جیسی شرمناک حرکت کے جواز میں پیش کیا جاتا ہے اور اس میں عائد کی گئی تین طلاق کی شرط کو دو لفظوں میں ''تین طلاق'' کہہ کر بھی پورا کر دیا جاتا ہے، اسی سے اگلی آیت میں لکھا ہے کہ

(دیکھنا) ''احکام الٰہی کا مذاق مت اڑانا'' (231/البقرۃ)

خدا کا تصور

کسی قوم میں خدا کے بارے میں پایا جانے والا تصور دراصل اس قوم کے تمدن کا خلاصہ ہوتا ہے کیونکہ جو قوم جیسے خدا کی عبادت کرتی ہے ویسی ہی وہ خود بھی ہوتی ہے یا یوں کہیے کہ جو قوم جیسی خود ہوتی ہے ویسے ہی خدا کی عبادت بھی کرتی ہے۔ یعنی با اصول معبود کے عابد بھی با اصول اور بے اصول معبود کے عابد بھی بے اصول ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے سلجھے ہوئے تصور سے قومیں سلجھ جاتی ہیں اور خدا کا تصور الجھ جائے تو قومیں بھی الجھ جاتی ہیں۔

خدا کا سلجھا ہوا تصور وہ ہوتا ہے جو انبیاء کرام پر اترنے والی وحی کے ذریعے خدا نے خود پیش کیا اور خدا کا الجھا ہوا تصور انسانی ذہن کی اختراع ہے (انسانی ذہن اپنی محدود استطاعت کی وجہ سے خدا کی لامحدود ہستی کے بارے میں از خود درست تصور قائم کر ہی نہیں سکتا)۔

قرآن گواہ ہے کہ کوئی قوم ایسی نہیں جس کی طرف کوئی نبی نہیں بھیجا گیا یعنی کوئی قوم ایسی نہیں جس تک خدا کا درست تصور نہیں پہنچا۔ انبیاء کرام اور صاحبانِ عقل و بصیرت (قرآن کی اصطلاح میں ''اولی الالباب'') نے خدا کے درست تصور کو زندگی کا نصب العین بنا لیا (17,18/الزمر، 10/الطلاق وغیرہ) جبکہ حکمرانوں اور سرمایہ پرستوں (قرآن کی اصطلاح میں ''مترفین'' اور ''الملا'') نے (مذہبی پیشوایت کی مدد سے) خدا کے درست تصور کی مخالفت کی (60,66,75/الاعراف، 27/ھود، 13/الانبیاء، 33/المومنون، 34/

سبا وغیرہ) ۔

قرآن کے بقول

اے محمد ہم نے تجھ سے پہلے بھی جس قوم کی طرف بھی کوئی رسول بھیجا، جو انہیں ان کی غلط روش کے تباہ کن عواقب سے متنبہ کرتا تھا تو وہاں سے سہل انگار و آسودہ حال لوگوں (مترفین) نے ہمیشہ یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ ہم نے جس مسلک پر اپنے آباؤ اجداد کو چلتے دیکھا ہے ہم اسی پر (آنکھیں بند کر کے) چلتے جائیں گے۔ کسی صورت بھی اس روش کو نہیں چھوڑیں گے (23,24/الزخرف)

''اے محمد اگر یہ لوگ تجھے جھٹلاتے ہیں تو (یہ کوئی نئی بات نہیں کہ) تم سے پہلے پیغمبر بھی جھٹلائے گئے ہیں (4/فاطر، 184/ال عمران) اور اے پیغمبر! اگر یہ تجھے جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے کتنی ہی قومیں اپنے اپنے وقت کے رسولوں کو جھٹلا چکی ہیں۔ نوح، عاد، ثمود، ابراہیم، لوط، اصحاب مدین اور موسٰی کو بھی جھٹلایا گیا'' (44-42/ العنکبوت 14-12/ق وغیرہ)

بادشاہوں، سرمایہ پرستوں اور مذہبی پیشواؤں نے ہمیشہ خدا کے درست تصور کی مخالفت اس لیے کی کہ ان کی بقا طبقاتی تقسیم میں مضمر ہوتی ہے جبکہ خدا کا درست تصور علامہ اقبال کے بقول بندہ اور بندہ نواز کی تفریق مٹا کر آقا اور غلام کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔

آپ خود ہی سوچیے کہ دوسروں کی محنت پر عیش و آرام کے عادی لوگ یہ کیسے گوارا کر سکتے ہیں کہ وہ کسی عام انسان کی طرح محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالیں۔ ان لوگوں کو اپنے باپ دادا کا تراشا ہوا تصور ہی اچھا لگتا ہے جو ان کی خواہشات کے

مطابق بھی ہوتا ہے اور انکے مفادات کا محافظ بھی ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ (چاہے کچھ بھی ہو) ہم تو اپنے باپ دادا کے نقشِ قدم پر ہی چلتے رہیں گے (23/الزخرف، 6,7/ص وغیرہ)۔

ہر نبی نے خدا کی طرف سے نازل ہونے والی وحی کے ذریعے لوگوں کی رہنمائی خدا کے درست تصور کی طرف کی لیکن ہر نبی کے بعد مترفین نے ہر نبی کی تعلیمات میں اپنے مفادات کی آمیزش کر کے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا۔

قرآن کے بقول

> اے محمد ہم نے تم سے پہلے (ایسا) کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا کہ (اس کے ساتھ ایسا نہ ہوا ہو کہ) جب اس نے احکام الٰہی کی تلاوت کی تو (وحی کے دشمن) لوگوں نے اس کی تلاوت کردہ (وحی) میں کچھ ملاوٹ کر دی۔ پس اللہ (دوسرا رسول بھیج کر) اس آمیزش کو مٹا دیتا رہا اور اپنے احکام کو محکم کرتا رہا۔ اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے (52/الحج) ہم نے یہ قرآن تم پر اس لیے نازل کیا کہ تم اس حقیقت کو ان کے سامنے واضح کر دو جس میں ان کے درمیان اختلاف ہو گیا ہے (63,64/النحل) قرآن خدا کی طرف سے نازل ہونے والی پچھلی تمام کتابوں کی تعلیم کو سچ کر دکھانے والی کتاب ہے (12/الاحقاف)

دیگر آسمانی کتابوں کے تو الفاظ تک تبدیل کر دیے گئے، لیکن قرآن کی حفاظت کا ذمہ کیونکہ خدا نے خود اٹھا رکھا ہے (9/الحجر) اور یہ ایسے زمانوں میں آیا جب اسے محفوظ کرنے کے مستند ذرائع وجود میں آ چکے تھے۔ اس کے الفاظ میں تبدیلی ممکن نہ رہی تو

فرعونیت، ہامانیت اور قارونیت (ملوکیت، مذہبی پیشوایت اور سرمایہ پرستی) کے گٹھ جوڑ نے یہ کیا کہ پہلے اپنی خواہشات کے مطابق روایات مرتب کیں پھر ان وضعی روایات کو حضور اکرمؐ اور صحابہ کرام سے منسوب کر کے قرآنی آیات کی شان نزول قرار دیا اور پھر ان کی روشنی میں قرآن کریم کی تفاسیر لکھ کر اور لکھوا کر قرآن کا مفہوم ہر ممکنہ حد تک اپنی ضروریات کے مطابق بنالیا (تفصیل ''قرآن کا دکھ'' میں ملے گی)۔

قرآن کہتا ہے کہ

''ان لوگوں کے لئے ہلاکت اور تباہی ہے جو اپنی طرف سے شریعت کے احکام لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ (احکام) خدا کی طرف سے ہیں تا کہ ان کے عوض تھوڑا سا فائدہ حاصل کر لیں۔ ان لوگوں نے اپنی طرف سے جو کچھ لکھا وہ بھی ان کے لئے تباہی کا سامان ہے اور اسے عوض جو فائدہ حاصل کیا وہ بھی وہ بھی موجب ہلاکت ہے''

(البقرۃ/79)

علامہ اقبال نے یونہی تو نہیں کہا کہ

قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر
چاہیں تو خود ایک تازہ شریعت کریں ایجاد

....

احکام ترے حق ہیں مگر تیرے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پازند

....

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

خودساختہ روایات کے ذریعے خدا کا جو بدترین تصور سامنے آتا ہے اسے دیکھنے سے پہلے ایک نظر دورِملوکیت میں پائے جانے والے سلاطین کے گھناؤنے تصور پر بھی ڈال لینی چاہیے تاکہ روایات کے خدا اور دورِملوکیت کے سلاطین میں موازنہ کیا جاسکے۔

دورِملوکیت کے سلاطین کسی قاعدے اور قانون کے پابند نہیں تھے... ان کی سلطنت میں رہنے والا ہر فرد ان کی مرضی کے مطابق جینے پر مجبور تھا... جسے چاہتے مسند پر بٹھادیتے، جسے چاہتے فرش پر گرادیتے ... کسی کی ذرا سی بات اتنی اچھی لگ جاتی کہ اسے بہت بڑے اعزاز وانعام سے نواز دیتے ... کسی کی ذرا سی بات اتنی بری لگتی کہ اسے زندہ جلائے جانے کی سزا سنادیتے.... اپنے قدموں میں گر کر رونے گڑگڑانے والوں پر مہربان ہوتے تو محض آہ وزاریوں کی بنیاد پر ان کی بڑی سے بڑی غلطی بھی معاف کردیتے.... ان کے یہاں اہلیت سے زیادہ رشوت اور سفارش چلتی تھی، ان تک رسائی حاصل کرنے کیلئے وسیلے کی ضرورت ہوتی تھی.... ان کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے ان کے درباریوں کو خوش کرنا پڑتا تھا اور درباریوں کی خوشی کیلئے وہ سب کام کرنے پڑتے تھے جو درباری کروانا چاہتے تھے۔

آپ خود ہی سوچیے کہ کیا کوئی غیرت مند انسان ایسے بادشاہ کے زیرِ اثر جینا گوارا کرسکتا ہے؟ کیا ایسی زندگی سے موت بہتر نہیں؟ اور یہ بھی سوچیے کہ کیا مروجہ اسلام میں خدا

کے بارے میں پایا جانے والا تصور بھی کسی ایسے ہی بادشاہ جیسا نہیں۔

مسلمانوں کی روایات کے مطابق

.... خدا بھی کسی قاعدے اور قانوں کا پابند نہیں.... اس کی خدائی میں رہنے والا ہر انسان بھی اس کی مرضی کے مطابق جینے پر مجبور ہے.... وہ بھی جسے چاہتا ہے ہدایت وعزت دے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہ وذلیل کر دیتا ہے.... وہ بھی کسی کی ایک ادا سے خوش ہو کر اس کے سارے گناہ معاف کر دیتا ہے اور کسی کی ایک ادا سے ناراض ہو کر اس کی ساری نیکیاں ضائع کر دیتا ہے .... وہ بھی آنسوؤں اور سسکیوں سے متاثر ہو کر بڑی سے بڑی غلطی بھی پل بھر معاف کر دیتا ہے.... اس کے یہاں بھی اہلیت سے کہیں زیادہ نیاز نزرانے اور اولیاء کی سفارشیں چلتی ہیں.... اس تک رسائی حاصل کرنے کیلئے بھی وسیلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے بھی پیروں فقیروں کو خوش کرنا پڑتا ہے اور پیروں فقیروں کی خوشی کیلئے تو لوگ اپنی اولاد تک قربان کر دیتے ہیں۔

خدا مروجہ تصور درست ہوتا تو آج مسلمان ناکامی و رسوائی کا شکار کیوں ہوتے، جبکہ قرآن کی رو سے اس تصور پر ایمان لانے کا لازمی نتیجہ کامیابی و کامرانی ہے؟

خدا کے بقول

اور تم میں سے جو لوگ (خدا کے درست تصور پر) ایمان لائے اور نظامِ خداوندی کو قائم کرنے کی کوشش (یعنی عملِ صالح) کرتے رہے، ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ خدا ان کو زمین میں حکومت عطا

کرے گا۔ جس طرح خدا نے اقوامِ سابقہ کو زمین کی حکومت عطا کی تھی (جو خدا کے درست تصور پر ایمان لائے تھے اور جنہوں نے اعمالِ صالح کیے تھے) اور اس نظامِ زندگی (یعنی دین) کو مستحکم کر دے گا جو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے۔ اور (اس طرح) ان کے خوف کو امن میں بدل دے گا (55/النور)

اب آیئے خدا کے قرآنی تصور کی طرف۔ یاد رکھیے کہ خدا قادرِ مطلق ہونے کے باوجود ہر کام ایک قاعدے اور قانون کے تحت کرتا ہے کہ خدا نے اپنی مرضی سے اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ انہی پابندیوں کو خدا کا قانون (قرآنی اصطلاح مے کلمۃ اللہ اور سنت اللہ) کہتے ہیں کہ ''اگر'' یہ ہوا ''تو'' یہ ہوگا اور ''ہمیشہ'' یہی ہوگا۔

''اگر'' ہائڈروجن کے دو اور آکسیجن کا ایک مالیکیول مل گئے ''تو'' پانی بن جائے گا اور ''ہمیشہ'' ایسا ہی ہوگا۔ ''اگر'' پانی نکتہ انجماد پر پہنچ گیا ''تو'' جم جائے گا اور ''ہمیشہ'' نکتہ انجماد پر ہی جمے گا وغیرہ وغیرہ (اس کے متعلق دعا کے عنوان میں بات ہو چکی ہے)۔

اسی قانون کے تحت خدا کی لامحدود کائنات کا حیرت انگیز نظام کسی کمی بیشی کے بغیر از خود جاری و ساری ہے۔ اسی قانون کو قانونِ مکانات عمل کہتے ہیں کہ اس قانون کے تحت ہر عمل از خود ایک خاص نتیجہ مرتب کرتا ہے اور ایک طرح کے عمل سے ہمیشہ ایک ہی طرح کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔

. . . . کیونکہ خدا کا قانون تغیر و تبدل کا شکار نہیں ہوتا (27/الکہف، 62/الاحزاب)

.... کیونکہ خدا کا قانون کسی کے لیے نہیں بدلتا (64/یونس)

.... کیونکہ خدا کے قانون کو کوئی نہیں بدل سکتا (34,115/

الانعام)

.... کیونکہ یہ خدائے عزیز وحکیم کا وعدہ ہے جسے پورا کرنا اس نے اپنے اوپر لازم قرار دے رکھا ہے (9 /لقمان، 5 /فاطر، 55,77/المومن،38/النحل)

کوئی اور تو دور کی بات خدا اس قانون کو اپنے لیے بھی نہیں بدلتا۔ قرآن گواہ ہے کہ جب خدا کے بارے میں یہ عقیدہ قائم کیا گیا کہ خدا کی اولاد ہے تو خدا نے اس عقیدے کی تردیدیوں کی کہ

''خدا کے یہاں اولاد کیسے ہوسکتی ہے جبکہ خدا کی بیوی ہی نہیں'' (101/الانعام)

یعنی اگر خدا کی اپنی اولاد بھی ہوتی تو وہ بھی خدا کے بنائے ہوئے قانون مکافات عمل کے تحت ہی ہوتی اور اس قانون کے تحت ''اگر'' نر اور مادہ کا اختلاط ہو ''تو'' ہی اولاد ہوسکتی ہے۔

خدا اپنے قانون کو اپنے نبیؐ کے لیے بھی نہیں بدلتا۔ قرآن کے بقول

اے رسول ان سے کہو کہ اگر میں (بھی) رب (کے قانون) کی نافرمانی کروں تو میں (بھی) ڈرتا ہوں کہ ایک بڑے (خوفناک) دن مجھے (بھی) سزا بھگتنی پڑے گی (15/ الانعام)

اور حضورؐ نے فرمایا کہ

میں اللہ کی رحمت کا امیدوار ہوں اور ڈرتا ہوں اس کے عذاب سے (مسلم)

انسان قانون مکافات عمل کی پابندی پر تو مجبور ہے لیکن خدا کی مرضی کے مطابق

زندگی گزارنے پر مجبور نہیں۔ خدا کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے پر اس طرح مجبور نہیں کہ انسان کو اس بات کی مکمل آزادی حاصل ہے کہ وہ احکام الٰہی کی اطاعت کرے یا نہ کرے (29/الکہف) اور قانون مکافات عمل کی پابندی پر اسطرح مجبور ہے کہ ''اگر'' احکام الٰہی کی اطاعت کرے گا ''تو'' اسے جنت ملے گی (82/البقرۃ) اور ''اگر'' احکام الٰہی کی اطاعت نہیں کرے گا ''تو'' وہ جہنم میں جائے گا (81/البقرۃ)۔

یعنی انسان اپنی مرضی کے مطابق کوئی عمل بھی کر سکتا ہے لیکن قانون مکافات عمل کے تحت اس کا ہر عمل از خود ایک خاص نتیجہ مرتب کر لیتا ہے (تفصیل ''تقدیر'' کے عنوان میں لکھ دی گئی ہے)۔ یعنی انسان کو اس بات کا اختیار تو حاصل ہے کہ وہ اپنے کھیت میں بھنگ بیجے یا گندم لیکن اس بات کا اختیار حاصل نہیں کہ وہ بھنگ کے بیج سے گندم کا پودا اگا سکے کیونکہ قانون مکافات عمل کے تحت بھنگ کے بیج سے بھنگ کا پودا ہی اگ سکتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ''اگر'' انسان ہدایت وعزت حاصل کرنے کی کوشش کرے گا ''تو'' اسے ہدایت وعزت مل جائے گی اور ''اگر'' انسان گمراہ وذلیل ہونے کی کوشش کرے گا ''تو'' وہ گمراہ وذلیل ہو جائے گا (16,26/البقرۃ نیز دیکھیے 29/الانفال، 39/التوبۃ، 38/محمدؐ وغیرہ)۔

اسی لیے خدا نے کہا کہ

انسان جیسا عمل کرتا ہے اسے ویسا ہی بدلہ ملتا ہے (147/الاعراف)

آپ نے دیکھا کہ قانون مکافات عمل کے تحت جزا و سزا بالترتیب اچھے اور برے اعمال کا فطری نتیجہ ہے جو از خود مرتب ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اس نتیجے کو کسی طریقے سے بھی تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔

آپ خود ہی سوچیے کہ کیا آگ میں ہاتھ ڈالنے والے شخص کے ہاتھ کو کسی کی

سفارش جلنے سے بچا سکتی ہے؟ یا کیا کسی کا جلا ہوا ہاتھ آہوں، آنسوؤں، نیاز نذرانوں وغیرہ سے ٹھیک ہو سکتا ہے؟

کیونکہ قانونِ مکافاتِ عمل کے تحت ہر انسان اپنے کیے کا ذمہ دار خود ہوتا ہے لہذا کوئی دوسرا اس کی جگہ سزا بھگت سکتا ہے نہ توبہ کر سکتا ہے۔ آپ خود ہی سوچیے کہ کیا یہ بھی ممکن ہے کہ آگ میں ہاتھ تو آپ اپنا ڈالیں لیکن جلن اور سوزش کسی دوسرے کو ہو یا مرہم آپ اپنے ہاتھ پر لگائیں لیکن جلن اور سوزش سے نجات کسی دوسرے کو ملے؟

قرآن کہتا ہے کہ

جو کوئی نیک کام کرے گا اس کا اجر بھی اسی کو ملے گا اور جو کوئی بُرا کام کرے گا اس کا ضرر بھی اسی کو پہنچے گا کہ تمہارا خدا کسی پر ظلم کرنے والا نہیں (46/حم السجدۃ نیز دیکھیے 44/الروم، 07/ بنی اسرائیل)

اے محمدؐ ان سے کہہ دو کہ مجھ کو میرے اعمال (کا ثواب ملے گا) اور تم کو تمہارے اعمال (کا)۔ تم میرے اعمال کے لئے جواب دہ نہیں ہو اور میں تمہارے اعمال کے لئے جواب دہ نہیں ہوں (41/ یونس، 54/النور) خدا کے حضور کوئی بھی کسی دوسرے کے اعمال کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا (07/ الزمر، 18/ فاطر، 15/ بنی اسرائیل) وہاں نہ تو کسی کی سفارش سنی جاتی ہے نہ ہی کسی سے کوئی بدلہ قبول کیا جاتا ہے (254,123,48/البقرۃ)۔

چنانچہ حضورؐ نے فرمایا کہ

لوگ اپنے اپنے اعمال پر اٹھائے جائیں گے (متفق علیہ) تم میں سے ہر شخص کا محاسبہ اس طرح ہوگا کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی

وکالت کرنے والا نہیں ہوگا۔ وہ (بندہ) اپنے دائیں طرف دیکھے گا تو اسے اپنے اعمال کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا، پھر اپنے بائیں دیکھے گا ادھر بھی سوائے اپنے اعمال کے کسی اور کو نہیں پانے گا (بخاری، مسلم، ترمذی)

آپ سمجھ ہی چکے ہوں گے کہ قانونِ مکافاتِ عمل کے تحت ہر انسان کی راسائی براہِ راست خدا تک ہے اور اسی حقیقت کو قرآن یوں بیان کرتا ہے کہ

''خدا انسان کی رگ جان سے بھی زیادہ انسان کے قریب ہے'' (16/ق) ''خدا دل کے رازوں اور آنکھ کی خیانتوں تک سے آگاہ ہے'' (19/المومن، 16/ق، 7/ البلد وغیرہ)۔

حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ

''اللہ فرماتا ہے کہ میں بندے کے گمان سے بھی زیادہ (بندے کے) قریب ہوں (متفق علیہ) جب میرا بندہ مجھ کو یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ اپنے دونوں ہونٹوں کو حرکت دیتا ہے'' (بخاری)۔

خدا کا قرب حاصل کرنے کیلئے کسی کو ذریعہ بنانا قرآن کی رو سے ایک بے معنی سی بات ہے۔ رہا سوال خدا کی خوشنودی کا تو قرآن کے مطابق اسے حاصل کرنے کا واحد ذریعہ احکام الٰہی کی پیروی ہے، اسی اعتبار سے فضیلت کا معیار تقوی مقرر کیا گیا۔

قرآن کہتا ہے کہ ''خدا کے نزدیک فضیلت کا معیار صرف اور صرف تقوی ہے (13 / الحجرات)۔ اور اور حضورؐ نے فرمایا کہ ''اللہ تمھاری صورتوں اور تمھارے مالوں کو

نہیں دیکھتا بلکہ تمھارے دلوں اور تمھارے اعمال کو دیکھتا ہے'' (مسلم)

آپ نے دیکھا کہ قرآن وسنت پر ذرا سی فکر وتحقیق سے یہ بات کتنی واضح ہو جاتی ہے کہ

.... خدا (قادرِ مطلق ہونے کے باوجود) ایک غیر متبدل قانون (مکافاتِ عمل) کے ذریعے خود بھی چل رہا ہے اور کائنات کو بھی چلا رہا ہے (یہی تو اس کی عظمت ہے).... خدا نے اس قانون کے تحت ہر انسان کو اپنی مرضی کے مطابق کوئی بھی عمل کرنے کی مکمل آزادی دے رکھی ہے لیکن اس بات کی آزادی نہیں دی کہ وہ اپنی مرضی کے عمل سے اپنی مرضی کے نتائج بھی حاصل کر سکے .... مکافاتِ عمل کے تحت عزت و ذلت، ہدایت و گمراہی وغیرہ انسان کے اپنے ہی اعمال کا فطری نتیجہ ہے .... مکافاتِ عمل کے تحت اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ انسان کی رائی برابر نیکی بھی ضائع چلی جائے یا معمولی سے معمولی گناہ بھی مواخذہ سے بچ جائے۔

.... مکافاتِ عمل کے تحت برے اعمال کے برے نتائج سے بچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ان اثرات کے مرتب ہونے سے پہلے ان کی تلافی (یعنی توبہ) کے ذریعے ان کا اثر زائل کر دیا جائے .... مکافاتِ عمل کے تحت ہر انسان اپنے کیے کا ذمہ دار خود ہوتا ہے یعنی کوئی بھی انسان کسی بھی دوسرے انسان کے اعمال کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا .... اور اس قانون کے تحت ہر انسان کی رسائی (کسی واسطے، وسیلے یا ذریعے کے بغیر) براہِ راست خدا تک ہوتی ہے۔

یہ ہے خدا کا وہ تصور جو قوموں کو خود کفیل، خوددار، خود مختار، مستقل مزاج، عادل اور ہمدرد بنا دیتا ہے۔ یہی ہے وہ تصور جس پر ایمان لانے والی قوموں کو کامیابی و کامرانی ملتی ہے اور یہی وہ تصور ہے جس سے انکار کرنے والی قومیں رسوا اور ذلیل ہوتی ہیں۔ کیا آپ بھول گئے کہ خدا کے درست تصور کو اپنا کر آج سے کم و بیش چودہ سو سال پہلے مسلمانوں کی ایک قلیل تعداد نے دنیا کے بیشتر حصے پر غلبہ و اقتدار حاصل کر کے تعمیر و ترقی اور امن و محبت کا پیغام ہر خاص و عام تک پہنچایا اور یہی وہ تصور ہے جسے ترک کر کے آج اربوں مسلمان کیڑے مکوڑوں کی طرح جی بھی رہے ہیں اور مر بھی رہے ہیں۔

توبہ

گرد و غبار سے اٹے ہوئے اس اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان کو ایک ریڑھی پر سبزیاں بیچتے ہوئے دیکھ کر چوھدری صاحب اپنے آپ سے بڑے شرمندہ ہوئے کیونکہ اس غریب نوجوان نے کچھ ہی عرصہ پہلے ان کے دفتر میں اسسٹنٹ مینیجر کی خالی اسامی کیلئے لئے گئے امتحان میں غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا، لیکن انہوں نے ایک دوست کی سفارش پر دوسرے نوجوان کو منتخب کر لیا۔

چوھدری صاحب کا ضمیر انہیں ملامت کرنے لگا۔ انہیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے انکی روح کسی بھاری چیز کے نیچے دب گئی ہے۔ انکی زبان سے بے اختیار 'استغفر اللہ ربی من کل ذنب واتوب الیہ' کا وظیفہ جاری ہو گیا۔ انہوں نے صدقِ دل سے توبہ کر لی کہ وہ آئندہ ایسی ناانصافی نہیں کریں گے اور انہیں یوں محسوس ہوا جیسے انکی روح سے کوئی بھاری چیز اٹھ گئی ہے۔ کیا چوھدری صاحب کی توبہ قبول ہو گئی کیونکہ وہ اب سفارش نہیں سنتے؟ لیکن وہ غریب نوجوان تو اب بھی ریڑھی ہی لگاتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چوھدری صاحب کی توبہ سے اس نوجوان کو کیا فائدہ پہنچا جسے انہوں نے نقصان پہنچایا تھا؟

توبہ کے بارے میں عام طور پر جو عقیدہ پایا جاتا ہے وہ قرآن وسنت کی روشنی میں درست دکھائی نہیں دیتا۔ لغت کی رو سے ''**تَابَ ۔ توباً ۔ توبۃً ۔ مَتَاباً** ۔ کے معنی ہیں واپس آجانا (تاج العروس، محیط المحیط، لطائف اللغۃ)۔ وہ اس طرح کہ آپ زندگی کے سفر پر رواں دواں ہیں، راستے میں ایک چوارہا آیا جہاں سے آپ ایک طرف کو مڑ

گئے۔ چند قدم آگے جا کر آپ کو محسوس ہوا کہ آپ کا قدم غلط سمت کو اٹھ گیا ہے، صحیح راستہ یہ نہیں۔ اب آپ کو صحیح راستے کی طرف جانے کے لئے اس مقام تک لوٹ کر آنا ہوگا جہاں سے آپ کا قدم غلط سمت کو اٹھا تھا۔ اس واپسی کو توبہ کہتے ہیں۔

اس بات کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ کہیں جانے کی جلدی میں آپ نے ایسا جوتا پہن لیا جو آپ کو تنگ ہے۔ کچھ ہی دیر چلنے کے بعد آپ کا پاؤں دُکھنے لگا اور آپ کو احساس ہوا کہ آپ نے غلط جوتا پہن لیا ہے۔ اب صحیح جوتا پہننے سے پہلے آپ کو غلط جوتا اتارنا ہوگا۔ یعنی صحیح سمت میں قدم اٹھانے سے پہلے اس مقام پر واپس آنا ہوگا جہاں سے آپ کا قدم غلط سمت کو اٹھا تھا، اور آپ کی یہ واپسی توبہ کہلائے گی۔

توبہ کا مطلب غلط کام کو undo کرنا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ توبہ ایک عملی اقدام ہے جسے زبانی طور پر نہیں کیا جا سکتا۔ آپ خود ہی سوچیے کہ چوراہے والی مثال میں جہاں آپ کو احساس ہوا کہ آپ غلط راستے پر چل رہے ہیں وہاں کھڑے کھڑے اگر آپ ساری زندگی بھی استغفراللہ کا ورد کرتے رہیں، تو کیا پھر بھی اس مقام پر واپس آ سکتے ہیں جہاں سے صحیح راستہ شروع ہوتا ہے؟ یا جوتے والی مثال میں غلط جوتا پہننے پر آپ خلوصِ نیت سے زبانی طور پر چاہے جتنا بھی پچھتائیں، کیا آپ کا پاؤں صحیح جوتے میں داخل ہو سکتا ہے؟ جو غلطی عملی طور پر سرزد ہوئی ہو اسے undo بھی عملی طور پر ہی کیا جا سکتا ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ نہ تو آپ چوراہے پر خود بخود واپس آ سکتے ہیں نہ ہی آپ کا جوتا خود بخود اتر سکتا ہے۔

ان مثالوں سے یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ غلط مقام سے واپس چوراہے پر پہنچنے کے لیے یا غلط جوتا اتار کر صحیح پہننے کے لیے آپ کو کچھ وقت بھی تو درکار ہوگا۔ اور اگر یہ وقت آپ کے پاس نہیں تو آپ کی واپسی ممکن نہیں۔ اسی لیے قرآن کی رو سے ایسی صورت میں توبہ

قبول نہیں ہوسکتی کہ جب غلطی کے ازالے کا وقت ہی نہ رہے (54/الزمر، 18/النساء، 29/السجدۃ، 85-84/المومن وغیرہ)۔ یہی وجہ ہے کہ فرعون کی توبہ بھی قبول نہیں ہوئی تھی (90/یونس)۔

یہاں یہ اہم نکتہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اگر آپ نے کسی کی حق تلفی کر دی تو آپ کی توبہ یہ ہوگی کہ آپ اس کا حق لوٹا دیں اور آئندہ کسی کی حق تلفی نہ کریں، اور اگر آپ نے کوئی نشہ کر لیا تو آپ کی توبہ یہ ہوگی کہ آئندہ نشہ نہ کریں لیکن اگر نشے میں دھت ہو کر کسی کو کوئی نقصان پہنچا دیا تو پھر توبہ یہ ہوگی کہ آئندہ نشہ سے اجتناب کے علاوہ اپنی وجہ سے ہونے والے نقصان کی تلافی بھی کریں۔

قرآن کریم میں آتا ہے کہ

اعمالِ حسنہ میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ غلط اعمال کے نقصان رساں نتائج کا ازالہ کر دیں (114/ھود)

چنانچہ حضورؐ نے فرمایا کہ

برائی (سرزد ہو جائے تو اس) کے بعد نیکی کر، وہ اسے مٹا دے گی (ترمذی)

مثال کے طور پر آپ نے طیش میں آ کر کسی کو خنجر کے وار سے زخمی کر دیا، نتیجے کے طور پر جتنا زخم اس کے جسم پر لگے گا اتنا ہی آپ کی روح پر بھی لگ جائے گا۔ آپ کی توبہ یہ ہوگی کہ اپنے کیے پر دل سے شرمندہ ہوں یعنی آئندہ کبھی ایسی غلطی نہ کریں اور اس غلطی کی تلافی کے طور پر اپنے ہاتھوں زخمی ہونے والے کا علاج کروائیں۔ جس قدر اس کے جسم کا زخم بھرے گا اسی قدر آپ کی روح کا زخم بھی بھرے گا۔

اگر آپ کے احساسِ ندامت سے پہلے ہی آپ کے طفیل اس کے جسم کا کوئی حصہ

مکمل طور پر ضائع یا مفلوج ہو گیا (یعنی آپ کے دیے ہوئے زخم کے بھرنے کا امکان ختم ہو گیا) تو پھر آپ کی توبہ یہی ہو سکتی ہے کہ آپ اس شخص کی وہ تمام ذمہ داریاں پوری کریں جنہیں پورا کرنے کی استطاعت وہ آپ کے دیے ہوئے زخم کی وجہ سے وہ کھو چکا ہے۔ ہر دو صورتوں میں آپ کے اچھے عمل سے آپ کے برے عمل کے نقصان رساں نتائج کا ازالہ ہو جائے گا۔

یہاں آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی طیش میں آ کر کسی کو قتل کر دے تو اس کی توبہ کیونکر ممکن ہو سکتی ہے (کہ وہ مقتول کو زندہ تو نہیں کر سکتا)؟ تو بات یہ ہے کہ مقتول کی ذمہ داریاں نبھانے کے علاوہ مقتول کے وارثوں سے معافی طلب کرنی ہو گی کیونکہ قرآن کی رو سے اگر مستغیث، مجرم کو (کسی زور زبردستی کے بغیر یعنی اپنی خوشی سے) معاف کر دے تو یہ چیز مجرم کی سزا کا کفارہ ہو جائے گی (45/المائدہ)

توبہ کے بارے میں قرآن کا موقف قصہ ابلیس و آدم سے اور بھی اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ انسان (آدم) جنت میں امن و اطمینان کی زندگی بسر کر رہا تھا کہ وہاں

ہر طرف رزق کی فراوانی تھی (62/مریم)

جس کا جہاں سے جی چاہتا تھا، کسی روک ٹوک کے بغیر (پیٹ بھر کر) کھالیتا تھا (35/البقرۃ)

ہر انسان روٹی کپڑا مکان کی فکر سے مکمل طور پر آزاد تھا (118/119, طہ)

کسی انسان کے دل میں عداوت و حسد کے جذبات نہیں تھے (43/الاعراف، 47/الحجر)

تمام انسان ایک برادری کی حیثیت سے رہتے تھے (19/یونس)

ہر طرف امن ہی امن تھا، سلامتی ہی سلامتی تھی (46/الحجر)
نہ کوئی رنج تھا نہ کوئی تکان (35/فاطر)

لیکن اپنے (پست و سرکش جذبات) ابلیس نے انسان کو (تفرقہ بازی) ''مشاجرت'' میں مبتلا کر دیا۔ انسان کی امن و سلامتی برباد ہوگئی اور اس جرم کی پاداش میں خدا نے اسے جنت سے نکالے جانے کے احکام صادر فرماتے ہوئے کہا کہ

(اس جنت سے) نیچے کر جاؤ (کیونکہ سرکشی کا یہی نتیجہ ہے) تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ اب تمھارے لئے زمین میں ایک معین مدت تک کے لئے ٹھکانہ اور سامانِ زیست ہے (36/البقرۃ)

علامہ اقبال نے کہا کہ

شجر ہے فرقہ آرائی تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

غلطی بلیس نے بھی کی اور آدم نے بھی لیکن ابلیس نے اپنی غلطی خدا کے ذمے ڈال دی اور کہا کہ

''اے خدا تو نے مجھے گمراہ کیا'' (16/الاعراف، 39/الحجر)۔ اور خدا نے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دھتکار دیا (18/الاعراف، 34/الحجر) کہ جس نے اپنی غلطی ہی تسلیم نہیں کی وہ اپنی غلطی کی تلافی (یعنی توبہ) کیا کرے گا؟

لیکن آدم نے اپنی غلطی تسلیم کر لی اور یہ کہتے ہوئے توبہ کا دروازہ کھٹکھٹایا کہ

''اے ہمارے رب ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا (ہم مانتے ہیں کہ یہ ہماری اپنی غلطی ہے) اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ کیا

تو ہم خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے‘‘(23/الاعراف)

اور خدا نے ان کے اس اعتراف سے خوش ہو کر انہیں ان کی کھوئی ہوئی جنت واپس نہیں دے دی بلکہ ان سے یہ کہا کہ

’’ہم تمہاری طرف ہدایت بھیجتے رہیں گے۔تم میں سے جو اس ہدایت کی پیروی کرے گا اسے اسکی کھوئی ہوئی جنت مل جائے گی‘‘ (38/البقرۃ)۔

یعنی تم نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور تمہیں تمہارے گناہ کی تلافی (یعنی توبہ) کا موقع مل گیا،لیکن یہ تلافی عملی طور پر ہی ہوسکتی ہے۔لہذا تم اس ہدایت پر عمل کرنا جو ہماری طرف سے وحی کی صورت میں تم تک پہنچے۔اس ہدایت پر عمل کر کے تم زمین میں جنت کی ایک شاخ قائم کر سکتے ہو یعنی ایک ایسا معاشرہ تشکیل دے سکتے ہو جس میں انہی خوبیوں کی جھلک دکھائی دے جو تمھاری کھوئی ہوئی جنت میں نمایاں تھیں،اگر تم نے ایسا کر دکھایا تو تمھاری توبہ (تلافی) ہو جائے گی اور تم فردوسِ گم گشتہ میں دوبارہ داخل کر دیے جاؤ گے بصورتِ دیگر ہماری ہدایت پر عمل نہ کر کے تم زمین میں جہنمی معاشرے کی داغ بیل ہی ڈال سکتے ہو جس کی پاداش میں تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں ڈال دیے جاؤ گے (تمھاری توبہ قبول نہیں ہوگی)۔یہ ہے توبہ کا قرآنی مفہوم۔

اب آیئے چوھدری صاحب کی طرف لیکن اس سے پہلے حضور اکرمؐ کے اس فرمانِ مبارک پر ذرا توجہ دیجئے کہ

تم میں سے کوئی اپنی (بے حد قیمتی) گمشدہ چیز پا کر جتنا خوش ہوتا ہے خدا اس سے بھی زیادہ اپنے بندے کی توبہ سے خوش ہوتا ہے (ترمذی)

اس حدیث کو اگر توبہ کے مروجہ مفہوم کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا مطلب کیا نکلتا ہے؟ یہی کہ چوھدری صاحب اپنے کیے پر شرمندہ ہوئے، انہوں نے آئندہ کسی کی حق تلفی نہ کرنے کا عہد کر لیا لیکن استطاعت کے باوجود اس اعلیٰ تعلیم یافتہ غریب نوجوان کو اس کا حق نہیں دیا جو ان کی وجہ سے ریڑھی پر سبزیاں بیچ رہا ہے؟ پھر بھی خدا چوھدری صاحب سے اتنا خوش ہے جتنا کوئی اپنی کھوئی ہوئی قیمتی چیز پا کر ہوتا ہے؟ آپ خود ہی فرمائیے کہ کیا ایسا ممکن ہوسکتا ہے؟ کیا آپ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ خدا چوھدری صاحب سے خوش اُسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ اس غریب نوجوان کو اس کا حق مل جائے جو چوھدری صاحب نے دبا رکھا ہے؟

جب چوھدری صاحب اپنی غلطی پر نادم ہوئے اس وقت اگر غریب نوجوان ان کی رسائی سے باہر باہر جا چکا ہوتا تو ان کی توبہ یہ ہوتی کہ وہ سفارشی نوجوان کو ملازمت سے نکال کر اس کی جگہ کسی ایسے شخص کو تعینات کرتے جو اس کا اہل ہو، ساتھ ہی ساتھ چوھدری صاحب ہر ممکن طریقے سے غریب نوجوان کی تلاش بھی جاری رکھتے۔

اگر وہ نوجوان اپنی معاشی خستہ حالی سمیت انہیں مل جاتا تو خلوصِ نیت سے اس کے حالات بہتر کرنے کی کوشش کرتے، اور اگر اس حال میں ملتا کہ اسے چوھدری صاحب والی ملازمت کی ضرورت ہی نہ ہوتی (یعنی چوھدری صاحب کے احساسِ ندامت سے پہلے ہی اسے کوئی اور بہتر ملازمت مل چکی ہوتی) تو چوھدری صاحب کی توبہ اس طرح ہوسکتی ہے کہ وہ نوجوان سے معافی حاصل کرتے اور کسی دوسرے کے ساتھ کبھی ایسی زیادتی نہ کرتے۔

لیکن اب جبکہ وہ غریب چوھدری صاحب کی رسائی میں ہے تو ان کی توبہ اسی صورت میں ہوسکتی ہے کہ وہ فوری طور پر سفارشی نوجوان کو ملازمت سے نکال کر اس کی جگہ

غریب نوجوان کو لگا دیں (تا کہ چوھدری صاحب واپس اس مقام پر پہنچ سکیں جہاں سے ان کا قدم غلط سمت میں اٹھا تھا) اور اس کے بعد کبھی کسی کی حق تلفی نہ کریں (یعنی صحیح سمت میں چلتے رہیں)، بصورتِ دیگر چوھدری صاحب کی توبہ نہیں ہوسکتی۔

میں آدمی ہوں جس طرح ہوتے ہیں آدمی

کیا آپ کی توجہ کبھی اس طرف بھی گئی کہ قرآن حضور اکرمؐ کی زندگی کو نوع انسانی کے لئے ''اسوہ حسنہ'' قرار دیتا ہے (21/الاحزاب) یعنی خدا یہ چاہتا ہے کہ ہم حضور اکرمؐ کے نقش قدم پر چلیں اور انؐ جیسا بننے کی کوشش کریں لیکن اگر کوئی ہمیں قرآنِ حکیم کی یہ منشا پوری کرنے کو کہے تو ہم لاشعوری طور پر خوف زدہ ہو کر پہلے توبہ کرتے ہیں اور پھر یہ کہتے ہیں کہ ''کہاں ہم عام سے انسان اور کہاں خدا کا آخری نبیؐ؟ ہماری کیا مجال کہ ہم (حضور اکرمؐ جیسا بننا تو دور کی بات) انؐ جیسا بننے کے بارے میں سوچ بھی سکیں''۔

کون نہیں جانتا کہ قرآن حضور اکرمؐ سیرت کو دو الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے کہ آپؐ صادق تھے، آپؐ امین تھے، تو کیا کسی اور کے لیے ممکن نہیں کہ وہ صداقت اور امانت کی روش اپنا سکے؟ حضورؐ رزقِ حلال کھاتے، محنت کرتے، ہمسائیوں کے حقوق کا خیال رکھتے، چھوٹوں سے شفقت کرتے، بڑوں کی عزت کرتے، عفو و درگزر سے کام لیتے وغیرہ وغیرہ تو کیا ہم اپنے اندر یہ خوبیاں پیدا نہیں کر سکتے؟

بات یہ ہے کہ خدا اور رسولؐ کے دشمن (بادشاہ، سرمایہ پرست اور مذہبی پیشوا۔ قرآنی اصطلاح میں ''مترفین'') اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ تھے کہ قرآنی نظام کے قیام کے لئے حضور اکرمؐ کی سیرت کو اپنانا ضروری ہے۔ چنانچہ انہوں نے وضعی روایات کے ذریعے یہ عقیدہ اکثر مسلمانوں کے ایمان میں داخل کر دیا کہ حضور اکرمؐ مافوق البشر قوتوں کے مالک تھے۔ لہذا کسی بشر کیلئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ حضور اکرمؐ جیسا بن سکے۔ ایسا

اس لئے کیا گیا تا کہ مسلمان حضور اکرمؐ جیسا بننے کے بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دیں اور فرعونیت (ملوکیت)، قارونیت (سرمایہ پرستی) اور ہامانیت (مذہبی پیشوایت) سے پاک جنتی معاشرے کے قیام کا امکان ہی ختم ہو جائے۔

کیا آپ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ اگر حضورؐ مافوق البشر قوتوں کے مالک ہوتے تو قرآن ان کی زندگی کو دوسرے انسانوں (جو مافوق البشر قوتوں کے مالک نہیں) کے لئے بہترین قابلِ تقلید نمونہ (رول ماڈل) کیسے قرار دے سکتا تھا؟ کیا یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ خدا ہمیں ایک ایسا کام کرنے کے لیے کہے جو کرنا ہمارے لیے ممکن ہی نہ ہو؟

کیا آپ جانتے ہیں کہ قرآن کے بقول

''حقیقت یہ ہے کہ جب بھی اللہ کی ہدایت ظاہر ہوئی تو اس بات نے لوگوں کو ایمان لانے سے روکا کہ (متعجب ہو کر) کہنے لگے کہ کیا اللہ نے (ہماری ہی طرح کا) ایک آدمی پیغمبر بنا کر بھیج دیا ہے (94/بنی اسرائیل) کیا ہمارے ہی جیسا انسان ہمارا رہنما ہونے کا دعوٰی کرتا ہے؟ (6/التغابن)

(حضور اکرمؐ کے بارے میں بھی یہی کہا گیا کہ ہماری ہی طرح کیا ایک انسان پیغمبر کیسے ہو سکتا ہے کہ) ہماری ہی طرح اس کے بھی بیوی بچے ہیں (38/الرعد) ہماری ہی طرح یہ بھی کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ ایسا کیوں نہیں ہوا کہ اس کے ساتھ کوئی ڈرانے والا فرشتہ بھیج دیا جاتا ہے (7/الفرقان، نیز 33/المومنون)

اور خدا کہتا ہے کہ

(اے محمدؐ) ان سے کہو (کہ انسانوں کے لئے انسانوں کو ہی رسول

بنایا جا سکتا ہے) اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے اور سکونت پذیر ہوتے تو ہم ان کے لئے (یقیناً) آسمان سے (کسی) فرشتے کو (ہی) رسول بنا کر بھیجتے (95/بنی اسرائیل) ہم نے تم سے پہلے بھی جتنے پیغمبر بھیجے وہ سب کے سب (بھی انسان ہی تھے اور انسانوں ہی کی طرح) کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے (20/الفرقان)

کیا انہیں اسی بات پر اچھنبا ہوا ہے کہ انہی میں ایک آدمی پر ہم نے وحی کیوں بھیجی؟ (2/یونس) کہ (انکار و بدعملی کے نتائج سے) آگاہ کرنے والا (رسولؐ) انہی میں سے کیسے آ گیا؟ (2/ق) اے نبیؐ تمہاری بشریت پر اعتراض کرنے والوں کے دل غفلت میں پڑے ہوئے ہیں چنانچہ یہ ظالم لوگ چپکے چپکے سرگوشیاں کرتے ہیں (اور عوام سے کہتے ہیں) کہ یہ (محمدؐ) اس کے سوا کیا ہے کہ تمہاری ہی طرح کا ایک انسان ہے (3/الانبیاء) اے محمدؐ اس سے کہو کہ (ہاں) میں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوں کہ تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں البتہ میری طرف (اللہ کی طرف سے) وحی آتی ہے (110/الکھف، 6/حم السجدہ) (لیکن اس وحی میں میری اپنی کوشش و کاوش کا کوئی عمل دخل نہیں کہ) اللہ وحی کی رحمت کے لئے جسے چاہتا ہے خاص کر لیتا ہے (105/البقرۃ) (یعنی) اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے نبوت کا احسان کر دیتا ہے (11/ابراہیم) مجھے تو (وحی کے اترنے سے پہلے) معلوم ہی نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں

اور ایمان کیا ہوتا ہے (52/الشوریٰ) (اے محمدؐ ان سے کہو کہ) میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے غیبی خزانے ہیں۔ نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ ہی یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں (50/الانعام) اگر میں ایسا کہوں تو ظالموں میں شامل ہو جاؤں (31/ھود) (اے پیغمبرؐ ان سے کہو کہ) میرا حال تو یہ ہے کہ خود اپنی جان کا نفع و نقصان بھی اپنے قبضے میں نہیں رکھتا کہ یہ سب خدا کے قانون مشیت کے تحت ہوتا ہے (کیا تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے کہ اگر میں مافوق البشر قوتوں کا مالک ہوتا اور) اگر میرے پاس غیب کا علم ہوتا تو اپنے لئے فائدے ہی فائدے جمع کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچتی (188/الاعراف نیز دیکھیے 49/یونس، 21/الجن) اے رسولؐ ان سے کہو کہ اگر میں (بھی) اپنے رب (کے قوانین) کی نافرمانی کروں تو (میں بھی) ڈرتا ہوں کہ ایک بڑے (خوفناک) دن مجھے (بھی) سزا بھگتنی پڑے گی (15/الانعام)

آپ نے دیکھا کہ خدا نے خود حضور اکرمؐ کی زبان سے دوٹوک الفاظ میں اس بصیرت افروز حقیقت کا اعلان بھی کروا دیا کہ وحی کے امتیاز کے علاوہ حضور اکرمؐ دوسرے انسانوں ہی کے جیسے ایک انسان تھے اور اس ایمان پرور امر کی وضاحت بھی کروا دی کہ ایک بشر ہونے کے ناطے حضور اکرمؐ کے پاس کسی قسم کی کوئی مافوق البشر قوت نہیں تھی۔

یہی نہیں بلکہ خدا نے حضور اکرمؐ کی رسالت و بشریت کے فرق کو بھی خود حضورؐ ہی کی زبان سے ان الفاظ میں واضح کروا دیا کہ

''اے محمدؐ ان سے کہو کہ اگر میں غلطی کرتا ہوں تو میری غلطی کا وبال مجھ پر ہے اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو اس کی وجہ وہ وحی ہے جو میرا رب میرے اوپر نازل کرتا ہے (50/سبا)

چنانچہ حضرت رافعؓ سے روایت ہے کہ

آپؐ جب مدینہ تشریف لائے اس وقت لوگ کھجوروں کے درختوں میں تابیر (پیوندکاری) کیا کرتے تھے۔ آپؐ نے لوگوں سے فرمایا کہ اگر تم ایسا نہ کرو تو شاید تمھارے لیے بہتر ہو۔ لوگوں نے تابیر بند کر دی۔ اس سال پھلوں میں کمی ہوگئی تو حضورؐ نے فرمایا کہ میں بشر ہوں۔ جب کوئی دینی حکم دوں تو اسے مضبوط پکڑ لو اور جب اپنی رائے سے کچھ کہوں تو پھر میں انسان ہی ہوں (مسلم)

قرآن وسنت سے واضح ہوتا ہے کہ حضور اکرمؐ (ایک رسول ہونے کے ناطے) جو فیصلے وحی کی رہنمائی سے کرتے تھے ان میں غلطی کا امکان نہیں ہوتا تھا۔ لیکن (دوسرے انسانوں جیسا ایک انسان ہونے کے ناطے) جو فیصلے اپنی ذاتی بصیرت کی رہنمائی سے کرتے تھے ان فیصلوں کا دارومدار ظاہری شواہد پر ہوتا تھا اور ظاہری شواہد غلط بھی ہو سکتے تھے۔

چنانچہ حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ

آپؐ نے اپنے حجرے کے دروازے پر جھگڑا کرنے والوں کی آواز سنی تو باہر آ کر یہ الفاظ فرمائے کہ میں بھی انسان ہوں۔ میرے پاس معاملات آتے ہیں ممکن ہے بعض اہل معاملہ بعض سے زیادہ بلیغ ہوں۔ اور میں انہیں سچا سمجھ کر ان کے حق میں فیصلے کر دو (جب کہ وہ جھوٹے ہوں)۔ ایسی حالت میں جس شخص کو میں کسی مسلمان کا حق

دے دوں وہ اس کے لیے آگ کا ایک ٹکڑا ہے۔ اسے (اس بات کا پورا پورا) اختیار ہے اس آگ کے ٹکڑے کو وہ چاہے لے یا چھوڑ دے (مسلم۔ بخاری)

اس حدیث مبارکہ کی تشریح میں امام نووی لکھتے ہیں کہ

آپؐ نے اپنی بشریت کا اعلان اس لیے فرمایا کہ انسان غیب و باطن امر سے ناواقف ہوتا ہے جب تک خدا اسے مطلع نہ کر دے اور غیب کا پردہ نہ ہٹا دے۔ لہذا انسانی امور کا جو فیصلہ کیا جائے گا وہ ظاہر کو پیش نظر رکھ کر یعنی دلیل وحلف کو پیش نظر رکھ کر کیا جائے گا۔ ہوسکتا ہے ان سب باتوں کے باوجود جو فیصلہ دیا گیا ہے وہ واقعہ کے خلاف ہو۔ لیکن انسان صرف ظاہری حالات پر حکم لگانے اور فیصلہ کرنے پر مکلّف ہوتا ہے۔

اسی لیے تو حضورؐ نے فرمایا کہ

میں بشر ہوں جس طرح تم بھولتے ہو، میں بھی بھولتا ہوں۔ جب میں بھول جایا کروں تو مجھ کو بتا دیا کرو (مسلم)

اور یہ احادیث مبارکہ کہ دیکھیے کہ

اے اللہ محمدؐ بھی ایک انسان ہے۔ جس طرح ایک انسان کو غصہ آتا ہے محمدؐ کو بھی غصہ آتا ہے (مسلم) اے اللہ میں تجھ سے عہد لیتا ہوں تو اس کے خلاف نہ کرنا۔ میں ایک بشر ہوں جس مومن کو (کسی غلط فہمی کی بنیاد پر) اذیت دوں یا برا بھلا کہوں یا لعنت کروں یا کوڑے لگواؤں تو ان باتوں کو اس کی لیے رحمت و پاکیزگی کا سبب

اور قربت کا موجب بنا دے کہ اسے قیامت کے دن تیرا قرب
حاصل ہو (مسلم)

ایسے ہی کچھ معاملات پر قرآن میں تادیت بھی آئی ہے۔ مثال کہ طور پر غزوہ تبوک میں کچھ لوگوں کی منافقانہ عذر داریوں کو سچ سمجھ کر حضور اکرمؐ نے انہیں عدم شمولیت کی اجازت دے دی۔ تو پروردگارِ عالم نے کہا کہ

(اے محمدؐ) خدا تجھے معاف کرے تو نے انہیں (پیچھے رہ جانے کی)
رخصت کیوں دے دی (تجھے چاہیے تھا کہ تو انہیں رخصت نہ دیتا تا
کہ) تجھ پر آشکارہ ہو جاتا کہ کون لوگ سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی تم
جان لیتے۔ (حقیقت یہ ہے کہ) جو لوگ فی الواقعہ اللہ اور آخرت پر
یقین رکھتے ہیں وہ کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ ہم اپنے جان و مال سے
جہاد کرنے سے معذور ہیں۔ لہذا ہمیں جنگ میں عدم شمولیت کی
اجازت دی جائے (43,44-59,81-83 / التوبہ)

ایک اور موقع پر حضور اکرمؐ نے کسی خاص چیز کو نہ کھانے کا عہد کر لیا جس پر خدا نے فرمایا کہ

اے نبیؐ! جس چیز کو خدا نے تیرے لئے حلال قرار دیا ہے تُو اسے اپنی
بیویوں کی رضامندی کے لئے (قسم کھا کر) اپنے اوپر حرام کیوں قرار
دیتا ہے (1 / التحریم)

قرآن حضور اکرمؐ سے کہتا ہے کہ

اپنے معاملات میں (بہتر حل تک پہنچنے کے لئے) جماعت مومنین
سے مشورہ کر لیا کرو (159 / ال عمران)

چنانچہ حضور اکرمؐ قرآن میں مذکور اصولوں کی تفاصیل طے کرتے ہوئے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا کرتے تھے اور کئی بار ایسا ہوتا تھا کہ ان کی رائے کو اپنی رائے پر ترجیح دیتے۔ مثال کے طور پر مشکوۃ کتاب الاذان میں ہے کہ

> حضور اکرمؐ نے نماز کی تفاصیل طے کرتے ہوئے پہلے یہ حکم دیا کہ ناقوس بجا کر لوگوں کو نماز کے لئے بلایا جائے۔ لیکن پھر حضرت عبداللہؓ بن زید کے مشورے پر (ناقوس والا حکم منسوخ کر کے) اذان کے ذریعے لوگوں کو نماز کے لئے جمع کرنے کا حکم دے دیا (ابو داؤد۔ دارمی۔ ماجہ)

یہی نہیں بلکہ (حضور اکرمؐ کی دی ہوئی جلیل القدر تعلیم و تربیت سے صحابہ کرامؓ کو فکر و عمل کی وہ آزادی میسر آئی تھی کہ) جب حضور اکرمؐ کسی معاملے میں انہیں اپنی رائے سے آگاہ فرماتے تو وہ بلا تکلف آپ سے یہ دریافت کرتے کہ کیا یہ رائے وحی کی صورت میں خدا کا نازل کردہ حکم ہے یا حضورؐ کا ذاتی مشورہ ہے۔ اگر یہ خدا کا حکم ہوتا تو اس سے اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن اگر یہ حضورؐ کا ذاتی مشورہ ہوتا تو صحابہؓ کئی بار بلا تامل اس سے اختلاف کر گزرتے تھے۔ مثال کے طور پر قرآن کریم میں ہے کہ

> حضور اکرمؐ نے حضرت زید بن حارث سے کہا کہ اپنی بیوی (حضرت زینبؓ) کو طلاق مت دو اور اللہ سے ڈرو۔ لیکن حضرت زیدؓ نے حضور اکرمؐ کا مشورہ نہیں مانا اور حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی (37/الاحزاب)۔

اور تاریخ گواہ ہے کہ اس واقعہ سے حضور اکرمؐ اور حضرت زیدؓ کے باہمی تعلقات پر ذرا سا فرق بھی نہیں پڑا۔ اس واقعہ کے بارے میں مولانا مودودی لکھتے ہیں کہ

حضرت زیدؓ کے ساتھ حضورؐ کے تعلقات کئی طرح کے تھے۔ ایک تعلق یہ تھا کہ آپؐ اُن کے پیشوا تھے اور وہ آپؐ کے پیرو تھے۔ دوسرا تعلق یہ تھا کہ آپؐ اُن کے برادرِ نسبتی تھے اور وہ آپؐ کے بہنوئی تھے تیسرا تعلق یہ تھا کہ آپؐ اُن کے مربّی تھے اور وہ آپؐ کے پروردہ تھے۔ بیوی (حضرت زینبؓ) سے اُن کا نباہ نہ ہو سکا۔ انہوں نے طلاق دینے کا ارادہ کیا۔ آپؐ نے اُن کو وہی مشورہ دیا جو ہر برادرِ نسبتی اپنی بہنوئی کو اور ہر سرپرست اپنے پروردہ کو دے گا، یعنی یہ کہ خدا کا خوف کرو اور اپنی بیوی کو طلاق نہیں دو۔ مگر جس اختلافِ مزاج کی بناء پر زوجین میں باہم نفرت ہو گئی تھی اُس کو حضرت زیدؓ خود زیادہ محسوس کر سکتے تھے۔ یہ معاملہ اُن کے دین و ایمان کا نہیں بلکہ اُن کے حسیاتِ نفس کا تھا۔ اس لیے انہوں نے حضورؐ کے مشورے کو قبول نہیں کیا اور طلاق دے دی۔ یہ خلاف ورزی رسولؐ کے مقابلہ میں نہ تھی، نہ حضورؐ نے جو مشورہ دیا تھا وہ رسول خدا کی حیثیت سے تھا، اس لیے نہ آپؐ ناراض ہوئے نہ خدا ناراض ہوا۔ اگر حضورؐ کی جگہ کوئی اور ایسا شخص ہوتا جس نے کسی کو بچپن میں پالا ہوا اور اُس پر احسانات کیے ہوں اور آخر میں غلامی سے داغ دار ہونے کے باوجود اپنی بہن کی شادی اُس سے کی ہو، اور پھر اُس نے باوجود منع کرنے کے اُس کی بہن کو طلاق دے دی ہو، تو وہ ضرور ناراض ہوتا۔ مگر حضورؐ صرف مربّی اور برادرِ نسبتی ہی نہیں تھے بلکہ خدا کے رسولؐ بھی تھے، اور رسول ہونے کی حیثیت سے یہ بھی آپ کا فرض تھا کہ انسان کو انسان

کی بندگی سے آزاد کریں اور انسان کو انسان کے مقابلہ میں آزادی کا کھویا ہوا حق واپس دلوائیں۔ اس لئے آپؐ نے حکم نہیں بلکہ مشورہ دیا اور اس مشورہ کے خلاف عمل کرنے پر قطعاً کسی ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا۔ اسی سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آپ ؐ کی ذات میں حیثیتِ نبوی اور حیثیتِ بشری الگ الگ بھی تھیں اور باہم پیوستہ بھی تھیں۔ آپؐ نے ان دونوں کے استعمال میں ایسا حیرت انگیز توازن قائم کیا تھا کہ ایک نبی ہی ایسے توازن پر قادر ہوسکتا ہے۔ حیثیتِ بشری میں بھی آپ اس طرح عمل فرماتے تھے کہ نبوت کے فرائض اُس کے ضمن میں ادا ہوتے رہتے تھے۔ (سیرت سرورِ عالم صفحہ 255, 256)

آزادی رائے کو ترقی دینے کی چند اور مثالیں مولانا مودودی ہی کے بقول ملاحظہ فرمایئے کہ

جنگِ بدر کے موقع پر حضورؐ ابتدا میں جہاں خیمہ زن ہوئے تھے وہ جگہ مناسب نہیں تھی۔ حضرت حبابؓ بن منذر نے آپؐ سے دریافت کیا کہ اس مقام کا انتخاب وحی کے ذریعہ کیا گیا ہے یا محض ایک تدبیرِ جنگ کے طور پر ہے؟ فرمایا وحی نہیں ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ اگر ایسا ہے تو میری رائے میں آگے بڑھ کو فلاں مقام پر خیمہ زن ہونا چاہیے۔ چنانچہ حضورؐ نے اُن کی رائے کو قبول فرمایا اور اسی پر عمل کیا۔

اسیرانِ جنگ بدر کے مسئلہ میں حضورؐ نے صحابہ ؓ کی جماعت سے مشورہ لیا اور خود بھی ایک عام رکنِ جماعت کی حیثیت سے رائے

دی۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے آپؐ کی اور صدیقِ اکبرؓ کی رائے سے بے تکلف اختلاف کیا جس کا واقعہ تمام تاریخوں میں مشہو رہے۔ اسی مجلس میں حضورؐ نے خود اپنے داماد ابوالعاس کا مسئلہ بھی پیش کیا اور صحابہ نے فرمایا کہ اگر آپ کی مرضی ہو تو ان سے فدیہ میں جو ہار لیا گیا ہے وہ انہیں واپس کر دیا جائے۔ جب صحابہؓ نے بخوشی اس کی اجازت دی تب آپؐ نے انہیں ہار واپس کیا۔

غزوہ خندق کے موقع پر حضورؐ نے بنی غطفان سے صلح کرنے کا ارادہ فرمایا۔ انصار کے سرداروں نے عرض کیا کہ اگر یہ ارادہ وحی کی بناء پر ہے تو مجالِ کلام نہیں، اور اگر حضورؐ اپنی رائے سے ایسا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس تجویز سے اختلاف ہے۔ حضورؐ نے انہی کی رائے قبول فرمائی اور اپنے ہاتھ صلح نامہ چاک کر ڈالا۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر تمام مسلمانوں کو بظاہر دب کر صلح کرنا پسند نہیں تھا۔ حضرت عمرؓ نے اعلانیہ اس سے اختلاف کیا۔ مگر جب حضورؐ نے فرمایا کہ یہ کام میں خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے کر رہا ہوں تو باوجود یہ کہ غیرتِ اسلامی کی بنا پر سب ملول تھے، کسی نے دم مارنے کی جرأت نہیں کی۔ حضرت عمرؓ مرتے دم تک اس غلطی کے کفارے طرح طرح سے ادا کرتے رہے کہ وہ ایک ایسے امر میں حضورؐ سے اختلاف کر بیٹھے جو بحیثیتِ رسول کیا جا رہا تھا۔

جنگ حنین کے موقع پر تقسیمِ غنائم میں آپؐ نے مؤلّفۃ القلوب کے ساتھ جو فیاضی ظاہر فرمائی تھی اُس پر انصار چیں بجبیں ہوئے۔ حضورؐ

نے ان کو بلایا اپنے فعل کی تائید میں یہ نہیں فرمایا کہ میں خدا کا نبی ہوں جو چاہوں کروں، بلکہ ایک تقریر کی جس طرح ایک جمہوری حکومت کا امیر اپنی رائے سے اختلاف رکھنے والوں کے سامنے کرتا ہے۔ اُن کے ایمان بالرسالت سے اپیل نہیں کی بلکہ اُن کی عقل اور ان کے جذبات سے اپیل کی اور انہیں مطمئن کر کے واپس فرمایا۔

یہ تو خیر اُن لوگوں کے ساتھ معاملہ تھا جو سوسائٹی میں بڑی اونچی پوزیشن رکھتے تھے نبیؐ نے غلاموں اور لونڈیوں تک میں استقلال رائے کی روح پھونک دی تھی۔ بریرہ ایک لونڈی تھی جو اپنے شوہر سے متنفر ہوگئی تھی۔ مگر شوہر اس کا عاشقِ زار تھا۔ وہ اس کے پیچھے روتا پھرتا تھا۔ نبیؐ نے اس سے کہا کہ تو اپنے شوہر سے رجوع کر لیتی تو اچھا تھا۔ اس نے پوچھا ''یا رسول اللہؐ کیا آپ حکم دیتے ہیں''؟ آپؐ نے جواب دیا ''حکم نہیں بلکہ سفارش کرتا ہوں''۔ اس نے کہا ''اگر یہ سفارش ہے تو میں اُس کے پاس جانا نہیں چاہتی''۔

اس قسم کی اور بہت سے مثالیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب قرینہ سے یا خود حضورؐ کی تصریح سے لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ آپؐ کوئی بات اپنی رائے سے فرما رہے ہیں تو وہ آزادی کے ساتھ اس میں اظہار رائے کرتے تھے اور آپؐ خود اس آزادانہ اظہار رائے میں اُن کی ہمت افزائی فرماتے تھے۔ ایسے موقع پر اختلاف کرنا نہ صرف جائز تھا، بلکہ آپؐ کے نزدیک پسندیدہ تھا، اور آپؐ خود بسا اوقات اپنے رائے سے رجوع فرما لیتے تھے۔ (ایضاً صفحہ

254-255)

قرآن وسنت گواہ ہیں اور اس بات میں ابہام والجھن کا کوئی ہلکا سے امکان بھی نہیں ہے کہ

''اس فرق کے ساتھ کہ حضور اکرمؐ پر وحی اترتی تھی، حضور اکرمؐ دوسرے انسانوں ہی کی طرح کے ایک انسان تھے'' (110/ الکھف، 2/ یونس، 2/ ق، 6/ حم السجدۃ)

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ 'میری بڑھا چڑھا کر تعریف نہ کیا کرو جس طرح عیسائیوں نے حضرت مریم علیہ السلام کے بیٹے کی کی۔ یقیناً میں تو صرف ایک بندہ ہوں۔ تعریف کے بجائے مجھے عبداللہ (اللہ کا بندہ) اور اس کا رسولؐ کہا کرو' (بخاری، مسلم)۔ اور حضرت مطرفؒ بن عبداللہ کا بیان ہے کہ 'میں بنی عامر کے وفد کے ساتھ رسول اللہؐ کی بارگاہ میں حاضر ہوا ہم عرض گزار ہوئے کہ آپؐ ہمارے سید (سردار) ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ سردار تو خدا کی ذات ہے۔ ہم عرض گزار ہوئے کہ آپ ہم میں بڑی بزرگی اور عطا والے ہیں۔ تو حضورؐ نے فرمایا کہ اپنی بات کرو یا کوئی اور بات کرو، مبادا شیطان تمہیں بے لگام کر دے' (ابو داؤد) ایک اور موقع پر حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ 'مجھے اتنا نہ بڑھانا جتنا نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ بن مریم کو بڑھایا کیونکہ میں تو خدا کا بندہ ہوں۔ لہٰذا مجھے خدا کا بندہ اور رسول کہو' (متفق علیہ)

غور کیجئے کہ قرآن وسنت سے حضور اکرمؐ کی بشریت کتنی باریکی سے بیان ہوتی ہے اور کتنی وضاحت سے اجاگر ہوتی ہے۔ تاکہ کسی کو اس بات میں کسی قسم کا کوئی شک نہ رہے کہ حضور اکرم (طبیعی اعتبار سے) بالکل اسی طرح کے ایک انسان تھے جس طرح کے انسان دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔ لہٰذا جس راستے پر حضورؐ چلے اس راستے پر دوسرے لوگ

بھی چل سکتے ہیں اور جو نظام حضورؐ نے قائم کیا وہ نظام دوسرے لوگ بھی قائم کر سکتے ہیں۔

یاد رکھئے کہ خدا نے وحی (قرآن) کے ذریعے جس بے مثال و محیر العقول نظام کی طرف حضورؐ کی رہنمائی کی اس نظام (یا جتنی معاشرے) کو حضور اکرمؐ نے دوسرے انسانوں ہی کی طرح کے ایک انسان کی حیثیت سے قائم کیا۔ یہی حضور اکرمؐ کا وہ بے مثال امتیاز ہے کہ جس کی بناء پر حضورؐ کی زندگی کو تمام نوع انسانی کے لئے اسوہ حسنہ (بہترین قابل تقلید نمونہ) قرار دیا گیا۔ اور یہی حضور اکرمؐ کی وہ لازوال عظمت ہے کہ جس کی بنا پر انسانیت حضور اکرمؐ کی ہستیء مبارک پر صحیح معنوں میں فخر کر سکتی ہے۔

راہِ گم گشتہ

کیا یہ دانشمندی کی بات ہے کہ کوئی مریض اپنی صحت یابی کیلئے ڈاکٹر کی لکھی ہوئی دوائیاں کھانے کے بجائے صبح دوپہر شام ان دوائیوں کے نام پڑھتا رہے؟ کیا ایسے مریض سے نادان بھی کوئی ہوسکتا ہے جسے ڈاکٹر کا لکھا ہوا نسخہ یاد تو زبانی ہو لیکن یہ معلوم ہی نہ ہو کہ اس نسخے میں لکھا کیا ہے؟ اور کیا ایسے مریض سے ڈاکٹر خوش ہوسکتا ہے؟ تو پھر ایسے لوگوں سے خدا کیسے خوش ہوسکتا ہے جو خدا کی ہدایت (قرآن کریم) پر عمل کرنے کی بجائے اسے سوچے سمجھے بغیر پڑھتے رہتے ہیں؟ جنہیں قرآن یاد تو زبانی ہے لیکن یہ معلوم ہی نہیں کہ اس میں لکھا کیا ہے؟

کیا ہم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ مریض ڈاکٹر کے نسخے یا ڈاکٹر کی چاہے جتنی بھی تعریف کرے یا ڈاکٹر کے نسخے کو چاہے جتنے بھی خلوص سے پڑھے اس کی بیماری دور نہیں ہوسکتی کیونکہ صحت یابی کے لیے نسخے کو سمجھ کر اس پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے؟ تو پھر قرآن کو بلا سمجھے اور اس پر عمل کیے بغیر چاہے جتنی بھی خضوع وخشوع سے کیوں نہ پڑھا جائے، کیا اس سے وہ فائدہ حاصل ہوسکتا ہے جس کے لیے یہ عظیم نسخہ نازل کیا گیا؟

نسخہ ڈاکٹر کا ہو یا خدا کا اس سے فائدہ اٹھانے کا واحد راستہ یہی ہے کہ اسے سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے، لیکن عمل نام کی کوئی شے تو اسلام کے دشمنوں نے مسلمانوں میں باقی رہنے ہی نہیں دی۔ ان لوگوں کی ذہانت کو داد دینی پڑتی ہے کہ جنہوں نے پہلے اسلاف پرستی اور روایت پرستی (جو قرآن کی رو سے بدترین فعل ہے) کو مسلمانوں کے ایمان میں شامل کیا

اور پھر مسلمانوں کے اسلاف سے ایسی روایات منسوب کر دیں کہ جنکا مرکز ومحور ہی بے عملی ہے۔ ایک روایت کے مطابق تو قرآن کی سطروں پر انگلی پھیرنے سے بھی ثواب مل جاتا ہے؟ آپ خود ہی سوچیے کہ اگر کسی مریض کو کسی طریقے سے اس بات کا یقین دلا دیا جائے کہ وہ ڈاکٹر کے نسخے پر انگلی پھیرنے یا اسے یاد کر لینے سے صحت یاب ہوسکتا ہے تو وہ اس نسخے پر عمل کرنے کا تردد کیوں کرے گا؟

اسی قسم کی روایات نے مسلمانوں کو قرآن سے بیگانہ کر دیا اور خدا کا تخلیق کردہ دین خدا کے دشمنوں کے تخلیق کردہ مذہب میں تبدیل ہونے لگا۔ وہ اسلام جو انسانوں اور خدا کے درمیان اجتماعی رشتے کا نام تھا انسان اور خدا کا ذاتی تعلق بن گیا۔ وہ مسلمان جو اپنے نصیب پر حکومت کیا کرتے تھے اپنے نصیب کے قیدی بن گئے۔ وہ سر جو خدا کے آگے جھکا کرتے تھے پیروں فقیروں کے آگے جھکنے لگے۔ وہ ذہن جو نوع انسانی کی فلاح و بہبود کیلئے نت نئی ایجادات کیا کرتے تھے وظیفوں اور چلّوں کی کثرت سے بنجر و بیابان ہو گئے۔ وہ نگاہیں جو تعمیر و ترقی کے اجالوں میں محو پرواز رہتی تھیں تخریب و تنزلی کے اندھیروں میں اندھی ہو گئیں۔ وہ ہاتھ جو عملی طور پر بے سہاروں کا سہارا بنا کرتے تھے تسبیح پھیر پھیر کر مظلوموں کی دستگیری کا ثواب کمانے لگے۔ اور وہ آیات جو اس لئے اتاری گئی تھیں کہ انہیں سمجھ کر ان پر عمل کیا جائے جنتر منتر بنائی جانے لگیں۔

آپ کے ذہن میں رہ رہ کر یہ سوال پیدا ہو رہا ہو گا کہ قرآن میں ''تلاوت'' (121/البقرۃ، 72/الحج، 51/العنکبوت، وغیرہ) ''تسبیح'' (41/ال عمران، 33/طہ، 15/السجدۃ وغیرہ) اور ''ذکر'' (152/البقرۃ، 103/النساء، 227/الشعراء وغیرہ) کے بارے میں تو جگہ جگہ لکھا ہے؟ آپ کی بات درست ہے لیکن ''تلاوت''، ''تسبیح'' اور ''ذکر'' کا مروجہ مفہوم قرآن کی روشنی میں درست معلوم نہیں ہوتا۔

تلاوت کے بارے میں

''راغب اصفہانی نے کہا ہے کہ تِـلُـو و تُـلُـو کے معنی متابعت (پیچھے چلنے۔اتباع کرنے) کے ہوتے ہیں جو کہیں جسمانی طور پر ہوتی ہے اور کہیں احکام کا اتباع ہوتا ہے۔جسمانی طور پر پیچھے جانے کی مثال چاند کی ہے۔وَ الْـقَمَر اِ ذا تَلٰھَا(2/الشّمس)جس کے معنی ہیں ،چاند سورج کے پیچھے پیچھے چلتا ہے اور اس سے روشنی کا اقتباس کرتا ہے۔ تَتَلاّـۃُ تَتَّـلِیاً۔اس نے اس کا پیچھا کیا۔تَتَـلَّیْتُ حَـقِّـیْ۔میں نے اس کا پیچھا لے کر اس سے اپنا پورا پورا حق وصول کر لیا(تاج العروس محیط المحیط)۔

راغب کے نزدیک تِلَا وَۃَ بالخصوص خدا کی طرف سے نازل شدہ کتابوں کے اتباع کو کہتے ہیں ۔چونکہ اس اتباع کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ان احکام کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے اس لئے انہیں اس طرح پڑھنے کو بھی تِلَا وَۃ کہتے ہیں۔لیکن یہ لفظ قِرَ اءَ ۃ (پڑھنے) سے خاص ہے۔یعنی قِرَ اءَ ۃ (پڑھنا) بہرحال تِلَا وَۃَ کے اندر آ جاتا ہے لیکن تِلَا وَۃَ (اتباع کرنا) قِرَ اءَ ۃ کے اندر نہیں آتا(راغب)۔

قرآن کریم میں ہے

'جن لوگوں کو ہم نے یہ کتاب دی ہے وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ تلاوت کرنے کا حق ہے،یہی لوگ ہیں جو اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں'(121/البقرۃ)

اس آیت میں ظاہر ہے کہ تلاوت کے معنی اتباع کرنے کے ہی ہو سکتے ہیں ۔ کیونکہ ان لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہی لوگ درحقیقت اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ ورنہ اگر اس کے معنی فقط پڑھنے کے ہوں تو قرآن کو غیر مسلم بھی پڑھتے ہیں جو اس پر ایمان نہیں رکھتے۔ زیرِ بحث آیت کا درست مفہوم یہ ہوگا کہ

جن لوگوں کو ہم نے یہ کتاب دی ہے وہ اس کو سمجھ کر اس کی اطاعت کرتے ہیں جیسا کہ اس کو سمجھ کر اس کی اطاعت کرنے کا حق ہے، یہی لوگ ہیں جو اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں

اب آیئے تسبیح کی طرف

''سبحان اللہ کے معنی ہیں خدا کی طرف تیز رفتاری سے جانا اور اس کی اطاعت میں مستعد رہنا (تاج العروس) .....اور التسبیح خدا کی اطاعت میں تیزی کرنے کو کہتے ہیں (راغب)

قرآن کریم میں آتا ہے کہ

''آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے خدا کی تسبیح کرتا ہے'' (1/الحدید، 1/الحشر، 1/الصّف، 1/الجمعۃ) ''آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے خدا کی فرماں برداری کرتا ہے'' (83/ال عمران) ''آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے خدا کے آگے سجدے میں گرا ہوا ہے'' (15/الرعد، 18/الحج) ''آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے خدا کے آگے سجدے میں گرا ہوا ہے اور فرشتے بھی (سجدہ ریز ہیں) اور وہ سرکشی نہیں کرتے اور اپنے پروردگار سے ڈرتے رہتے ہیں جو انکے اوپر موجود ہے اور (یفعلون ما یومرون) انہیں جو کچھ حکم دیا جاتا

ہے اسکی تعمیل کرتے ہیں'' (49,50/النحل) ''آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب خدا کا ہے اور (فرشتے) جو اسکے پاس ہیں وہ کبھی تکبر میں آ کر اسکی عبودیت (محکومی) سے سرتابی نہیں کرتے نہ (احکام کی تعمیل سے) تھکتے ہیں۔ وہ دن رات خدا کی تسبیح کرتے ہیں اور کبھی رکتے نہیں'' (19,20/الانبیاء نیز دیکھئے 38/حم السجدۃ، 5/الشوریٰ)

ان آیات سے کسی تبصرے کے بغیر یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن کی رو سے خدا کی تسبیح کرنے کا مطلب تسبیح پھیرنا نہیں بلکہ خدا کی فرماں برداری کرنا یا خدا کے آگے سجدے میں گرنا ہے اور خدا کی فرماں برداری یا خدا کے آگے سجدے میں گرنے کا مطلب ''یفعلون ما یو مرون'' یعنی کسی سستی اور سرتابی کے بغیر قرآن کی پیروی کرنا ہے۔

جہاں تک ذکر کا تعلق ہے تو

''التذکرۃ۔ جس سے کسی ضرورت کو یاد دلایا جائے (29/الدھر) الذکریٰ (90/الانعام) یاددہانی۔ ذکر حقہ۔ اس کے حق کی حفاظت کی اور اس کو ضائع نہیں کیا۔ اذکرو انعمۃ اللهِ عَلَيْكُمْ۔ تم پر جو خدا کے احسانات ہیں ان کی حفاظت کرو اور انہیں ضائع مت کرو (تاج العروس۔ راغب)

قرآن کی رو سے

اشیائے کائنات پر غور وفکر کرنا بھی خدا کا ذکر کرنا ہے (191/ال عمران، 13/النحل) رزق تلاش کرنا بھی خدا کا ذکر کرنا ہے (10/ الجمعۃ) غلطی کی تلافی (یعنی توبہ) کرنا بھی خدا کا ذکر کرنا ہے

(135/ال عمران) اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا بدلہ لینا بھی خدا کا ذکر کرنا ہے (227/الشعراء) باطل کے خلاف جنگ کرنا بھی خدا کا ذکر کرنا ہے (34,42/طہ) جنگ میں ثابت قدم رہنا بھی خدا کا ذکر کرنا ہے (45/الانفال) وغیرہ وغیرہ

دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ قرآن کریم کی رو سے خدا کا ذکر کرنے کا مطلب احکام الٰہی کو یاد رکھ کر انکی پیروی کرنا ہے۔ اسی لیے تو حضور اکرمؐ کی زندگی کو خدا کا ذکر کرنے والوں کیلئے اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا (21/الاحزاب) کہ آپؐ سے زیادہ قرآن کی اطاعت کسی نے بھی نہیں کی۔ حضرت عائشہؓ کے بقول 'اللہ کے نبیؐ کا اخلاق قرآن تھا' (مسلم)

اور یہ آیات دیکھیے کہ

یہ قرآن یاددہانی (تذکرہ) ہے۔ سو جو چاہے اپنے پروردگار تک پہنچنے کا (یہ) راستہ اختیار کرلے (18/المزمل) اور جو کوئی اپنے پروردگار کے ذکر سے منہ پھیرے گا خدا اس کو جہنم میں داخل کر دے گا (17/الجن)

خدا کا ذکر نہ کرنے والوں کو جہنمی قرار دیا گیا اور جنت تک پہنچنے کا ذریعہ خدا کا ذکر بتایا گیا، تو کون نہیں جانتا کہ جہنمی ہوتے ہی وہ لوگ ہیں جو احکام الٰہی کی پیروی نہیں کرتے اور جنت میں وہی جاسکتے ہیں جو احکامِ الٰہی کی اطاعت کرتے ہیں؟ ورنہ اگر ان آیات کو ذکر کے مروجہ مفہوم کے ساتھ پڑھا جائے تو کیا یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ جنت محض تسبیح پھیرنے اور دوزخ محض تسبیح نہ پھیرنے سے حاصل ہوتی ہے؟

قرآن میں واضح طور پر لکھا ہے کہ

اے محمد ان سے کہہ دو کہ میں تو اس حکم کی اطاعت کرتا ہوں جو (قرآن کی صورت میں) میرے پروردگار کی طرف سے میرے پاس آتا ہے (50,106/الانعام، 203/الاعراف، 15,109/ یونس وغیرہ)

(اے لوگو تم بھی) اس کتاب کی پیروی کرو جو تمھارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوئی (3/الاعراف، 55/الزمر وغیرہ)

خدا کی ''تسبیح اور ذکر'' کا قرآنی مفہوم حضرت موسیٰؑ کی اس دعا سے سمجھنا اور بھی آسان ہے کہ

''اے پروردگا۔ میرا سینہ کھول دے۔ میری مہم میرے لئے آسان کر دے۔ میری زبان کی گرہ کھول دے (تا کہ) میری بات لوگوں کے دلوں میں اتر جائے۔ نیز میرے گھر والوں میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا دے تا کہ ہم کثرت سے تیری تسبیح کر سکیں اور کثرت سے تیرا ذکر کر سکیں'' (34-25/طہ)

ظاہر ہے یہاں خدا کی تسبیح اور خدا کے ذکر کا مطلب احکام الٰہی کی پیروی اور انکا نفاذ ہی ہوسکتا ہے کیونکہ خدا نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو فرعون کے دربار میں تسبیح کے دانوں پر وظائف دہرانے یا دل پر ''حق ہو'' کی ضربیں لگانے کیلئے تو نہیں بھیجا تھا؟ حضرت موسیٰؑ کی مہم کا مقصد تو فرعون کا تختہ الٹنا (129/الاعراف) بنی اسرائیل کو فرعون کے مظالم سے نجات دلانا (105/الاعراف) اور فرعون کی قوم کو خدا کی طرف دعوت دینا (132/الاعراف) یعنی احکام الٰہی کی پیروی کرنا تھا۔

قرآن میں آتا ہے کہ

دلوں کو اطمینان اللہ ہی کے ذکر سے ہوتا ہے (28/الرعد)

اس آیت کو ذکر کے رائج معانی کے ساتھ دیکھا جائے تو اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ دلوں کو اطمینان تسبیح پھیرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ تو آپ خود ہی سوچیے کہ اگر مومنین کے دلوں کو اس طرح اطمینان حاصل ہوسکتا تو حضورؐ اور ان کے رفقاؓ کو اپنے دلوں کے اطمینان کی خاطر کفار سے برسرِ پیکار ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا آپ جانتے نہیں کہ قرآن کے مطابق مومنین کے دلوں کو اطمینان جنگِ بدر کے میدان میں ہوا تھا (126/ال عمران)؟

علامہ اقبال نے کہا کہ

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خود مست
یہ مذہبِ ملا و نباتات و جمادات

اب ذرا نزول قرآن کے مقاصد کو سامنے لائیے۔ خدا کہتا ہے کہ قرآن اسلئے نازل کیا گیا کہ تم عقل وفکر سے کام لے سکو (2/یوسف، 44/النحل، 29/ص وغیرہ) تاکہ تم قرآن کے مطابق فیصلے کرو (105/النساء، 48/المائدۃ وغیرہ) تاکہ اختلافات مٹ جائیں (64/النحل، 76/النمل) تاکہ نوع انسانی کو ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لے جایا جائے (1/ابراہیم)

کیا یہ مقاصد وظیفوں اور چلوں سے پورے کیے جا سکتے ہیں؟ یا ان کے حصول کیلئے حضور اکرمؐ اور ان کے رفقائے کار کی طرح ایک حکومت قائم کرنا ضروری ہے جس

کا قیام قرآن پر عمل کیے بغیر ممکن ہی نہیں؟

جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جو قرآن کو سمجھے بغیر پڑھتے ہیں یا قرآنی آیات کو وظیفوں اور چلوں میں استعمال کرتے ہیں یا تسبیح کے دانوں پر خدا کے نام دہراتے ہیں یا قلب پر حق ہو کی ضربیں لگاتے ہیں تو انہیں اس حدیثِ مبارکہ پر توجہ دینی چاہیے۔ حضرت ابو واقدؓ سے روایت ہے کہ

''حضورؐ نے حنین کا سفر اختیار کیا تو وہ ایک درخت کے پاس سے گزرے جس کا نام 'ذات انواط' تھا۔ بت پرست اس درخت کی شاخوں سے اپنے ہتھیار لٹکایا کرتے تھے تاکہ خوش نصیبی حاصل ہو۔ چند صحابہؓ جو ابھی نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، نے نبیء اکرمؐ سے درخواست کی کہ وہ بھی ان کے لیے کوئی ایسا درخت مقرر فرما دیں۔ اللہ کے نبی نے جواب دیا سبحان اللہ یہ تو وہی بات ہے جو موسیٰؑ کے لوگوں نے کہی تھی کہ ہمارے لیے بھی ایک دیوتا بنا لو جیسا کہ ان کے دیوتا ہیں (7/138)۔ قسم ہے مجھے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم سب بھی انہی کے راستے پر چلو گے جو تم سے پہلے گزرے ہیں'' (ترمذی، نسائی)

اس فرمانِ مبارک کی تشریح میں ڈاکٹر ابو امینہ بلال لکھتے ہیں کہ

''اس حدیث میں اللہ کے پیغمبرؐ نے نہ صرف خوش نصیبی کے طلسم کو رد کر دیا ہے بلکہ یہ پیش گوئی بھی کی کہ مسلمان عیسائیوں اور یہودیوں کے طور طریق نقل کیا کریں گے۔ 'تسبیح' کے دانے جو مسلمان 'ذکر' کے لیے عام طور پر استعمال کرتے ہیں کیتھولک عیسائیوں کی تسبیح کی نقل

ہے..... پیش گوئی تو سچ ثابت ہو چکی ہے'' (توحید کے بنیادی اصول، صفحہ 69)

اقبال نے خدا کی طرف سے جوابِ شکوہ میں یونہی تو نہیں کہا کہ

شور ہے ہوگئے دنیا سے مسلماں نابود
ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود
وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

یاد رکھیے کہ قرآن وسنت کے مطابق کتاب اللہ سے ثواب کمانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اسے سمجھ کر عملی طور پر اس کی اطاعت کی جائے۔ اسی لیے تو حضورؐ نے فرمایا کہ ''تم میں بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے'' (بخاری، ترمذی) اور محمد بن یوسفؒ مالک بن مغولؒ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے عبداللہؓ سے پوچھا کہ ''کیا نبیؐ نے کچھ وصیت فرمائی ہے.... انہوں نے فرمایا کہ حضورؐ نے کتاب اللہ پر عمل کرنے کی وصیت فرمائی ہے'' (مسلم)

وسیلہ

اس معصوم سی لڑکی کی عمر اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی، اور وہ تین چار سال سے ایک درگاہ میں پڑی، سارا سارا دن ایسی مظلومیت سے آہ وزاریاں کرتی رہتی ہے کہ روح لرز اٹھتی ہے۔ خدا جانے بیچاری پر ظلم کے کونسے پہاڑ ٹوٹے ہیں کہ جن کی یاد اسے بار بار اتنا رلاتی ہے کہ اس کی ہچکی بندھ جاتی ہے۔ کسی کے سوال پر کان ہی نہیں دھرتی یا پھر جواب میں آنسو بہاتی رہتی ہے لیکن منہ سے کچھ نہیں بولتی۔

لوگ کہتے ہیں کہ اس لڑکی کے ماں باپ اسے حضرت صاحب کے حکم کے مطابق زیارت پر چھوڑ گئے تھے کیونکہ حضرت صاحب کے بقول ''اللہ تعالیٰ نے اس اللہ لوک کو پیدا ہی زیارت کے لئے کیا تھا''۔

شروع شروع میں اس لڑکی کا بہت خیال رکھا جاتا تھا کیونکہ حضرت صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ''اگر اس اللہ لوک کو کوئی تکلیف پہنچ گئی تو میں قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کو کیا منہ دکھاؤں گا''۔ لہذا اسے ہر شام حضرت صاحب سے ملوانے لے جایا جاتا۔ لیکن اب وہ رات کو بھی اکثر زیارت میں ہی پڑی رہتی ہے کیونکہ اب حضرت صاحب فرماتے ہیں کہ اللہ لوکوں کے ساتھ زبردستی نہیں کرنی چاہیے، یہ جہاں چاہیں انہیں وہیں رہنے دو۔

اس لڑکی کا دکھ چین سے جینے نہیں دے گا اور اس لڑکے کا دکھ چین سے مرنے نہیں دے گا جسے اس کے باپ نے اپنے پیر کے حکم پر ''اللہ تعالیٰ کی خوشنودی'' کے لئے اپنے ہاتھوں سے ذبح کر دیا اور ان ننھے منے بچوں کا دکھ تو شاید مرنے کے بعد بھی چین نہ لینے

دے جنہیں انکے والدین ''منت'' کے طور پر ایک درگاہ میں چھوڑ جاتے ہیں۔ اور پھر ان بچوں کے نرم و نازک سروں پر لوہے کی ٹوپیاں چڑھا دی جاتی ہیں تا کہ ان کے سر مسخ ہو جائیں اور وہ اس درگاہ سے مخصوص ایک عجیب وغریب سی شکل اختیار کر لیں۔

خدا جانے ہماری غیرت کہاں مر گئی ہے کہ ہم خدا سے ڈرنے کے بجائے پیروں فقیروں سے ڈرتے ہیں۔ خدا کی نافرمانی تو بڑی بے خوفی سے سرعام بھی کر گزرتے ہیں لیکن ''حضرت صاحب'' کی نافرمانی کا خیال دل سے بھی گزر جائے تو مارے خوف کے کانپ اٹھتے ہیں۔ خدا کے آگے رونے گڑگڑانے کے بجائے پیروں فقیروں کے آگے روتے گڑگڑاتے ہیں۔ خدا سے مانگنے کے بجائے پیروں فقیروں سے مانگتے ہیں۔ کیا اسی کو خدا اور رسولؐ پر ایمان لانا کہتے ہیں؟

حضرت علامہ اقبالؒ کیا خوب فرماتے ہیں کہ

شہری ہو، دہاتی ہو، مسلمان ہے سادہ
مانندِ بتاں پُجتے ہیں کعبے کے برہمن

کہا جاتا ہے کہ حضرت صاحبان تو خدا تک پہنچنے کا ''وسیلہ'' ہیں۔ اس بارے میں قرآن کے احکام سامنے لانے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ عربی زبان میں لفظ وسیلہ کا مطلب وہ نہیں ہوتا جو اردو میں ہوتا ہے۔

لغت کی رو سے

عربی میں ''وسیلہ (و۔س۔ل)'' کے معنی ہیں مرتبہ، درجہ، قرب، منزلت، وغیرہ (تاج العروس، معیط المعیط، راغب)۔ لہذا قرآن کی جس آیت میں یہ کہا گیا کہ ''خدا کا وسیلہ طلب کرو'' اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خدا کا قرب حاصل کرنے کے لئے پیروں

فقیروں کو ذریعہ بناؤ (اردو میں وسیلہ کا یہی مطلب ہوتا ہے)۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ''خدا کے ہاں مرتبہ، درجہ، قرب، منزلت وغیرہ تلاش کرو''۔

پوری آیت سے وسیلہ کے معنی بالکل واضع ہو جاتے ہیں کہ

اے ایمان والو! قرآن کی پیروی (یعینی تقویٰ اختیار) کرو اور خدا کا وسیلہ (یعنی اس کے ہاں مرتبہ و منزلت وغیرہ) تلاش کرو اور (اس کا طریقہ یہ ہے کہ) اس کی راہ میں جہاد کرو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ (35/المائدہ)

اور یہ حدیث مبارک دیکھئے کہ جس سے کسی تشریح کے بغیر 'وسیلہ' کا درست مطلب خود بخود سامنے آ جاتا ہے۔حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ

''اللہ تعالیٰ سے میرے لئے وسیلہ مانگو۔صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ وسیلہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا جنت کا اعلیٰ درجہ'' (ترمذی)

قرآن میں لکھا ہے کہ

جن لوگوں نے خدا کے علاوہ اور دوست بنائے ہوئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم انہیں اس لئے پوجتے ہیں کہ یہ ہمیں خدا کے قریب کر دیں (3/الزمر)

کیا حضرت صاحبان کو خدا تک رسائی کا وسیلہ قرار دینے والے حضرات بالکل یہی بات نہیں کرتے؟ قرآن کہتا ہے کہ

جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں (وہ انہیں خدا کا قرب کیا دلائیں گے) وہ تو خود خدا کا وسیلہ (یعنی اس کے ہاں قدر و منزلت) ڈھونڈتے

(پھرتے) ہیں"۔(57 / بنی اسرائیل) (اس آیت سے وسیلہ کے معانی اور بھی کُھل کر سامنے آ گئے ہیں) (کیا یہ لوگ اتنا بھی نہیں جانتے کہ) خدا ہی نے انسان کو پیدا کیا اور خدا انسان کے دل سے گزرنے والے خیالات سے بھی واقف ہے اور خدا انسان کی رگِ جاں سے بھی زیادہ انسان کے قریب ہے (16 / ق) اے محمدؐ جب میرے بندے میرے بارے میں پوچھیں تو ان سے کہو کہ میں ان کے قریب ہوں (اتنا قریب) کہ جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار سنتا ہوں (186 / البقرۃ)

چنانچہ حضور اکرمؐ نے کہا کہ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں بندے کے گمان سے بھی زیادہ بندے کے قریب ہوں (متفق علیہ) اللہ تعالی فرماتا ہے کہ جب میرا بندہ مجھ کو یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ اپنے دونوں ہونٹوں کو حرکت دیتا ہے (بخاری)

حیرت ہے کہ لوگ پھر بھی خدا کو براہ راست نہیں پکارتے؟ لوگ سمجھتے ہیں کہ خدا پیروں فقیروں کی سفارشیں مانتا ہے۔ جبکہ قرآن کے بقول

اگر خدا کسی کی خواہشوں پر چلے تو آسمان اور زمین اور جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے سب درہم برہم ہو جائے (71 / المومنون) خدا کی بادشاہی میں کوئی شریک نہیں، نہ ہی وہ عاجز اور ناتواں ہے کہ کوئی اس کا مددگار ہو (111 / بنی اسرائیل)

خدا کے قوانین اور خدا کے فیصلے کسی کے لئے بھی (کبھی بھی) نہیں

بدلتے (43/فاطر، 64/یونس)

چنانچہ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ

تم میں سے ہر شخص کا اسطرح محاسبہ ہوگا کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی وکالت اور ترجمانی کرنے والا نہیں ہو گا۔ وہ (بندہ) اپنے دائیں طرف دیکھے گا تو اسے اپنے عمل کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا۔ پھر بائیں طرف دیکھے گا ادھر بھی سوائے اپنے اعمال کے کسی اور کو نہیں پائے گا (بخاری، مسلم، ترمذی) میں تم سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ (حقوق میں خیانت کے باعث) وہ کہے کہ یا رسول اللہ میری داد (مدد) کے لیے پہنچیے اور میں کہوں کہ میں تیرے لیے اب کچھ نہیں کرسکتا۔ میں شریعت کے احکام تجھ تک پہنچا چکا (مسلم)

سفارش کی بات یوں بھی بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ اچھے انسان کو خدا کے حضور سفارش کی ضرورت ہی کیا ہے اور برے انسان کی سفارش خدا کے حضور کر ہی کون سکتا ہے؟

لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ حضرت صاحبان غیبی طور پر مرادیں پوری کرنے یا نفع و نقصان پہنچانے کا اختیار رکھتے ہیں جبکہ قرآن کہتا ہے کہ

اے محمدؐ ان سے کہہ دو کہ میں (غیبی طور پر یعنی دستور خداوندی کے خلاف) تمہیں نفع ونقصان پہنچانے کا کچھ اختیار نہیں رکھتا (21/الجن)

غور کیجیے کہ جو اختیار خدا نے حضور اکرمؐ کو بھی نہیں دیا، کیا وہ کسی دوسرے کے پاس ہوسکتا ہے؟ کسی دوسرے کو نفع ونقصان پہنچانا تو دور کی بات قرآن تو یہاں تک کہتا ہے کہ

اے محمدؐ ان سے کہہ دو کہ میں اپنے آپ کو بھی (غیب سے) نفع و نقصان پہنچانے کا کچھ اختیار نہیں رکھتا یہ سب تو دستور خداوندی کے مطابق ہوتا ہے (188/الاعراف) (یعنی نہ زہر سے زندگی مل سکتی ہے نہ دودھ سے موت کیونکہ دستور خداوندی کے مطابق زہر جان لیوا اور دودھ جاں بخش ہے)۔

درگاہوں اور درباروں پر مرادیں مانگنے اور منتیں ماننے والے مسلمان یہ بھی نہیں سوچتے کہ وہ فرض نمازوں میں ہی روزانہ کتنی بار یہ کہتے ہیں کہ 'ایک نعبدو ایاک نستعین' کہ اے اللہ ہم تیری ہی معبودیت واطاعت اختیار کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں؟

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ حضرت صاحبان تعویزوں وغیرہ سے بھوت پریت وبلائیں وغیرہ ٹالتے ہیں تو حضور اکرمؐ کے یہ ارشادات دیکھ لیجیے کہ

اللہ اس کو ناکامی اور پریشانی سے دوچار کرے جو خود تعویز پہنتا ہے یا دوسروں کو پہناتا ہے (احمد۔الحاکم) یقیناً ٹونا، تعویز، گنڈا اور طلسم شرک ہیں (ابوداؤد۔ابن ماجہ۔احمد) نہ بیماری کا متعدی ہونا ہے نہ صفر کا ہونا ہے اور نہ ہی بھوت پریت ہیں (مسلم) شگون کوئی اچھی چیز نہیں (متفق علیہ) شگون لینا شرک ہے (ابوداؤد)

لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ پیروں فقیروں کے پاس غیب کا علم ہوتا ہے جبکہ قرآن واضع طور پر کہتا ہے کہ

اے محمدؐ کہہ دو کہ غیب کا علم صرف خدا کے لئے ہے (20/یونس)

اے محمدؐ ان سے کہہ دو کہ آسمانوں اور زمین میں سوائے خدا کے کوئی

بھی غیب کا علم نہیں رکھتا (65 / النمل)

لہذا جو شخص یہ کہتا ہے کہ وہ غیب کا علم رکھتا ہے وہ خدا ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے اور اس کے اس دعوے کو مان لینا کیا اسے خدا مان لینے کے مترادف نہیں؟ کوئی اور تو دور کی بات خود حضور اکرمؐ نے (قرآن کے بقول) اپنے بارے میں کہا کہ

میں تم سے نہ یہ کہتا ہوں کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں نہ ہی یہ (یہ کہتا ہوں) کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں.... اگر میں ایسا کہوں تو ظالموں میں شامل ہو جاؤں (31 / ہود)

(کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ) اگر میں غیب کی باتیں جانتا تو اپنے لئے دنیا بھر کے فائدے جمع کر لیتا اور کوئی تکلیف مجھے چھو بھی نہیں سکتی (188 / الاعراف)

حضرت صاحبان کے بارے میں ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ خدا اپنے ان نیک بندوں کو کرامات سے نواز دیتا ہے۔ حیرت ہے کہ ایسا کہنے اور ماننے والے اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ اگر ان کرامات کا تعلق نیکی و پارسائی سے ہوتا تو یہ کرامات سب سے زیادہ حضور اکرمؐ کے پاس ہوتیں لیکن آپؐ کے پاس تو قرآن کے مطابق ایسی کوئی کرامت نہیں تھی (59 / بنی اسرائیل)

قرآن میں کئی جگہ لکھا ہے کہ کفار آپؐ کی دعوت پر ایمان لانے کے لئے آپؐ سے کرامات و معجزات کا مطالبہ کرتے تھے (53 / ھود، 7 / الرعد، 50 / العنکبوت وغیرہ) کہتے تھے کہ

''ہم صرف اس صورت میں تم پر ایمان لائیں گے کہ تم زمین کو پھاڑ کر اس میں سے چشمہ جاری کر دو یا تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کا

باغ اگ جائے اور تم اس میں نہریں رواں کر دو۔ یا تم آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے قرآن کو جھٹلانے والوں پر گرا دو جیسا تمہارے بقول ایک دن ہوتا ہے۔ یا تم خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آؤ۔ یا تمہارے لئے سونے کا ایک گھر تعمیر ہو جائے۔ یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ'' (90-93 / بنی اسرائیل)

اور ان سب باتوں کے جواب میں خدا نے حضور اکرمؐ سے یہی کہا کہ

''اے محمدؐ ان سے کہہ دو کہ پاک ہے میرا پروردگار (میں یہ سب کچھ کس طرح کر سکتا ہوں) میں تو صرف ایک پیغام لانے والا انسان ہوں'' (93 / بنی اسرائیل) ''معجزے تو صرف خدا ہی کے پاس ہیں'' (50 / العنکبوت)

چنانچہ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ

.... مجھے اتنا نہ بڑھانا کہ جتنا نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ بن مریم کو بڑھایا کیونکہ میں تو خدا کا بندہ ہوں۔ لہذا مجھے خدا کا بندہ اور رسول کہا کرو (متفق علیہ)

.... یقیناً میں تو صرف ایک بندہ ہوں۔ تعریف کے بجائے مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہا کرو (بخاری۔ مسلم)

ایک اور مقام پر کہا گیا کہ

''اے رسولؐ اگر تمہیں یہ بات بہت گراں گزرتی ہے کہ یہ لوگ تمہاری دعوت کو جھٹلاتے کیوں ہیں (اور تم سوچتے ہو) کہ اگر تم میں اس کی طاقت ہو تو تم زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈ نکالو یا آسمان تک

کوئی سیڑھی لگا لو اور اس طرح انہیں کوئی معجزہ دکھاؤ (تو بات یہ ہے کہ) اگر خدا لوگوں کو زبردستی مومن بنانا چاہے تو وہ بڑی آسانی سے ایسا کر سکتا ہے۔ سو تم ان لوگوں میں شامل نہ ہونا جو جاہل ہیں‘‘
(الانعام/35)

آپ خود ہی فرمایئے کہ یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ کسی کے لئے یہ کہا جائے کہ وہ شخص بہت نیک ہے کیونکہ اسے آگ پر چلنا آتا ہے؟ یا یہ کہا جائے کہ فلاں شخص جھوٹ نہیں بول سکتا کیونکہ اسے ہوا میں اڑنا آتا ہے؟ بات یہ ہے کہ حضرت صاحبان کا کراماتی گوشہ دراصل ایک فن ہے جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں، کچھ مخصوص ریاضتوں سے کوئی شخص بھی (خواہ کسی بھی مذہب کا ماننے والا ہو) یہ کرامات حاصل کر سکتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو ہندو یوگیوں اور عیسائی راہبوں کے پاس یہ کرامات کہاں سے آتیں، بلکہ وہ تو اس فن کے بانی ہیں؟

یہاں ایک مشہور قصہ یاد آ رہا ہے کہ ایک ہندو نے ایک مسلمان بزرگ کی بزرگی کو للکارا، اور یہ کرامت دکھائی کہ وہ ہوا میں اُڑنے لگا۔ جواب میں مسلمان بزرگ نے یہ کرامت دکھائی کہ اپنے جوتے کو ہوا میں ہندو سے اونچا اُڑا دیا۔ جس سے وہ ہندو، مسلمان بزرگ کی بزرگی کا قائل ہو گیا۔

غور کیجئے کہ اس قصہ کو اپنے ایمان کا حصہ قرار دینے والے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ وہ جس طرح کی کرامت سے مسلمان بزرگ کی کی پارسائی ثابت کرتے ہیں اسی طرح کی کرامت انہیں للکارنے والے ہندو کے پاس بھی تو تھی؟ اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ بزرگ خدا کے بہت قریب تھے کیونکہ اُن کا جوتا ہوا میں اُڑتا تھا تو اس سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہندو بھی خدا کے کچھ قریب تو تھا ہی کہ اُس کا جوتا تو ہوا میں نہیں اُڑتا تھا لیکن وہ خود تو ہوا

میں اُڑتا تھا؟

لوگ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے کہ اسلام میں نیکی اور پرہیزگاری کا معیار ''ہوا میں اُڑنا'' نہیں بلکہ قرآن کی اطاعت کرنا ہے (صحابہ کرامؓ خدا کے قریب اس لیے تھے کہ اُن کے شب و روز قرآن کی اطاعت میں گزرتے تھے) اور اسلام کی تاریخ میں کہیں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ صحابہ کرامؓ کے پاس ایسی کرامات ہوئی ہوں جیسی کرامات سے حضرت صاحبان کی پارسائی و پرہیزگاری ثابت کی جاتی ہے؟

ایک حضرت صاحب کے بارے میں یہ بات عام ہے کہ انہوں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں اپنے شہر پر گرنے والے دو بھارتی بموں کو پھٹنے سے روک لیا تھا۔ حیرت ہے کہ ایسا سمجھنے والوں کی سمجھ میں یہ کیوں نہیں آتا کہ جب حضور اکرمؐ جنگ احد میں اپنی طرف آتے ہوئے ایک پتھر کو نہیں روک سکے (اور آپؐ کا چہرہ مبارک زخمی ہو گیا) تو کوئی دوسرا کسی بم کو پھٹنے سے کیسے روک سکتا ہے؟ کوئی یہ بھی نہیں سوچتا کہ اگر یہ حضرات بموں کو پھٹنے سے روک سکتے ہیں تو پھر انہوں نے افغانستان اور عراق کو امریکی بموں سے تباہ و برباد کیوں ہونے دیا جہاں کئی حضرت صاحبان کے اپنے مزار بھی گولہ بارود کی نذر ہو گئے؟ تو اس کا مطلب کیا یہ ہے کہ یہ لوگ جان بوجھ کر عالمِ اسلام کو کفر کے مظالم سے نہیں بچا رہے؟ اور یہ جو آئے روز خودکش بم بار پھٹتے رہتے ہیں جن کے ساتھ کتنے ہی معصوم لوگوں کے چیتھڑے بھی اُڑ جاتے ہیں؟ لیکن کوئی پیر فقیر انہیں بھی پھٹنے سے نہیں روکتا؟ تو اس کے معانی کیا یہ ہوئے کہ خودکش حملے حضرت صاحب کی مرضی سے ہوتے ہیں؟ حیرت ہے کہ ان کا سارا زور اپنے کمزور و مجبور مسلمان بھائیوں پر ہی چلتا ہے، وہ بھی فقط ان پر جو کسی حیلے یا بہانے سے ان کے زیرِ اثر آ جائیں، ورنہ بش جونیئر یا باراک ابامہ کا آج تک کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکا؟

حضرت صاحبان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ بڑے سخی ہوتے

ہیں کیونکہ ان کے آستانوں سے روزانہ سینکڑوں غریبوں کو پیٹ بھر کر کھانا ملتا ہے؟ یہ بات تو بڑی اچھی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ لنگر ان لوگوں کے اپنے پیسوں سے چلتے ہیں؟ یہ حضرات تو جو روٹی خود کھاتے ہیں کیا وہ بھی دوسروں کی کمائی کی نہیں ہوتی ؟ حضرت علامہ اقبالؒ کے بقول

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
نذرانہ نہیں سود ہے پیران حرم کا
ہر خرقہ ء سالوس کے اند رہے مہاجن

یاد رکھئے کہ قرآن کی رو سے پرہیز گار لوگ دوسروں کا کمایا ہوا مال اپنے آپ پر خرچ نہیں کرتے بلکہ اپنا کمایا ہوا مال دوسروں پر خرچ کرتے ہیں (18/الیل)۔ کیا آپ کو یہ بھی یاد نہیں کہ حضور اکرمؐ نبی اور خلیفہ ہونے کے باوجود اپنی محنت کی کمائی سے اپنا اور اپنے کنبے کا پیٹ پالتے تھے اور یہی حال خلفاء راشدین کا بھی تھا؟

کیا آپ حضور اکرمؐ کی یہ ارشادات گرامی بھی بھول گئے ہیں کہ

اللہ تعالیٰ اس مسلمان سے محبت کرتا ہے جو محنت کر کے روزی کماتا ہے
(ترغیب بحوالہ طبرانی)

نافرمانی ء رب کے طریقے نہ اختیار کرنا اور اپنے ہاتھ سے کام کرنا
سب سے افضل اور بہتر کمائی ہے (مسند احمد)

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کوئی تعویذوں اور دم درود وغیرہ (یعنی قرآنی آیات) کو رزق کا ذریعہ بنائے تو اس بارے میں حضور اکرمؐ نے بڑے واضح الفاظ میں فرما رکھا ہے کہ

جو قرآن پڑھے تو اسے اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا چاہیے کیونکہ (مستقبل میں) کچھ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو قرآن کو ذریعہ سوال بنائیں گے (ترمذی)

حضرت صاحبان کے بارے میں یہ تاثر بھی عام ہے کہ ان کے اختیارات ان کی زندگی تک ہی ہے محدود نہیں ہوتے بلکہ انکی موت کے بعد بھی قائم رہتے ہیں یعنی یہ لوگ مرنے کے بعد بھی ہر چیز سے باخبر رہتے ہیں۔ فریادیں بھی سنتے ہیں اور امداد بھی کرتے ہیں۔ یہ عقیدہ بھی قرآن وسنت کے سراسر خلاف ہے کیونکہ قرآن کے بقول

اس سے بڑھ کر بھٹکا ہوا اور کون ہے جو (اللہ کو چھوڑ کر) اسے پکارتا ہے جو قیامت تک اس کی پکار کا جواب نہیں دے سکتا (جواب دینا تو دور کی بات کہ جن لوگوں کو وہ پکارتا ہے) انہیں اس کا علم بھی نہیں ہوتا کہ کوئی انہیں پکار رہا ہے۔ وہ اس کی پکار سے یکسر بے خبر ہوتے ہیں (5/الاحقاف) جو لوگ قبروں میں دفن ہیں تم انہیں کچھ نہیں سنا سکتے (22/فاطر) اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار نہیں سن سکتے اور اگر وہ تمہاری پکار سن بھی لیں تو اس کا جواب نہیں دے سکتے (14/فاطر) وہ لاشیں ہیں بے جان، انہیں تو اتنا شعور نہیں کہ وہ خود کب اٹھائے جائیں گے (21/النحل) اور قیامت کے روز (جب وہ تمہارے روبرو ہونگے تو) وہ تمہارے شرک سے (یعنی یہ جو تم انہیں پکارتے رہتے ہو اس سے) نفرت و بیزاری کا اظہار کریں گے (14/فاطر)

چنانچہ حضور اکرمؐ نے بڑے سخت اور صاف الفاظ میں بار بار قبر پرستی

اور شخصیت پرتی کی مخالفت کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ

.... تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگ اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہیں بنا لیتے تھے تم قبروں کو عبادت گاہیں نہیں بنانا۔ یقیناً میں تمہیں ایسا کرنے سے منع کرتا ہوں (مسلم).... اللہ تعالیٰ کی یہودیوں اور نصاریٰ پر لعنت ہو جنہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہیں بنا لیا تھا (بخاری۔ مسلم۔ داؤد)... قبروں پر جانے والوں اور ان کو مسجدیں قرار دینے والوں اور چراغ جلانے والوں پر خدا کی لعنت ہے (داؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ وغیرہ)... میری قبر کو عید (یعنی جشن کی جگہ) نہ بنا دینا (بخاری، مسلم، ابوداود، ترمذی نسائی، ماجہ)... خدایا میری قبر کو بت نہ بنا کہ میرے بعد پوجی جائے (مالک)

اب فرمایئے کہ کیا اس بات میں شک وشبہے کہ کوئی گنجائش ہے کہ حضرت صاحبان کے متعلق رائج عقائد، قرآنِ کریم اور احادیثِ مبارکہ کی رو سے شرک کے زمرے میں آتے ہیں؟ لیکن غفلت کی نیند نے مسلمانوں کی آنکھوں پر اندھی تقلید کا ایسا پردہ ڈال دیا ہے کہ انہیں قرآن کی آیات بھی دکھائی نہیں دیتیں۔

خدا کہتا ہے کہ

یہ مبارک نصیحت (یعنی قرآن) جسے ہم نے اتارا ہے کہ کیا تم اس سے انکار کرتے ہو (50/ الانبیاء) (اگر انکار نہیں کرتے) تو پھر خدا کو چھوڑ کر ایسے لوگوں کو ساز کیوں بنا رکھا ہے جو (جو دستور خداوندی کے خلاف تمہیں نفع ونقصان پہنچانا تو دور کی بات) اپنے نفع ونقصان کا بھی کچھ اختیار نہیں رکھتے۔ (16/الرعد) یہ لوگ نہ تمہاری تکلیف دو

رکر سکتے ہیں نہ اسے بدل سکتے ہیں (56/ بنی اسرائیل) کیا ان لوگوں نے خدا کی مخلوق جیسی کوئی مخلوق پیدا کی ہے جو تم انہیں خدا کا شریک ٹھہراتے ہو (16/الرعد) یہ لوگ تو ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتے چاہے اسکے لئے سب اکٹھے ہو جائیں (مکھی بنانا تو دور کی بات) اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو یہ اس سے وہ بھی نہیں چھڑا سکتے (73/الحج) یہ لوگ تو کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے برابر بھی کسی چیز کے مالک نہیں (13/فاطر)

یہ ہے خدا کے بقول ان ہستیوں کے اختیارات کا عالم جنہیں ان کے ماننے والوں کے بقول خدا نے ساری دنیا کے اختیارات سونپ رکھے ہیں۔غور کیجئے کہ جن لوگوں کو خدا تک پہنچنے کا وسیلہ قرار دیا جاتا ہے خود خدا کے نزدیک انکا مقام کیا ہے؟ خدا کہتا ہے کہ

قرآن کی پیروی کرو اور اس کے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو (3/ الاعراف) قرآن ہی وہ کتاب ہے جو برحق ہے (31/فاطر) قرآن ہی وہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کا شک نہیں (2/البقرۃ) قرآن ہی وہ محکم سہارا ہے جو نہ کبھی ٹوٹ سکتا ہے نہ کبھی دھوکہ دے سکتا ہے (256/البقرۃ)

ان آیات سے آپ سمجھ ہی چکے ہوں گے کہ خدا تک پہنچنے کا وسیلہ کوئی حضرت صاحب نہیں بلکہ قرآن ہے۔اور قرآن بڑے غیر مبہم الفاظ میں اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ

مومنو! اکثر علماء و مشائخ لوگوں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں اور لوگوں کو خدا کے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں (34/التوبۃ)

حضرت علامہ اقبالؒ نے کیا خوب فرمایا ہے کہ

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
تصوف ، تمدن، شریعت، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

قرآن کا دُکھ

کیا آپ نے کبھی کسی ایسے جانور کو دیکھا ہے جسے اسکے مالک نے ایک چھوٹی سی رسی سے اسطرح جکڑ رکھا ہو کہ رسی کا ایک سرا اسکی ٹانگ اور دوسرا سرا اسکے سینگ یا گردن سے بندھا ہوا ہو، تاکہ وہ اپنی مرضی کی رفتار سے چلنے کے بجائے اپنے مالک کی مرضی کی رفتار سے چلے؟ عربوں کے یہاں اسطرح جکڑے ہوئے جانوروں (عام طور پر اونٹوں اور گھوڑوں) کو 'مہجور'' کہا جاتا تھا اور جس رسی سے انہیں جکڑا جاتا تھا اسے ''الہجار'' کہتے ہیں (تاج العروس)۔

اور کیا آپ کی نگاہ سے کبھی یہ آیت گزری جس کے مطابق آپؐ قیامت میں اپنے خدا سے کہیں گے کہ

''اے میرے رب! میری قوم نے قرآن کو 'مہجور' بنا دیا تھا''

(30/الفرقان)

یعنی مسلمانوں نے قرآن کو اپنی خودساختہ شریعت وطریقت ورسومات وروایات وتفاسیر وغیرہ کی رسی سے جکڑ کر اس کا مفہوم اپنی مرضی کے مطابق بنالیا تھا۔

علامہ اقبال کے بقول

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

حضور اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ

اللہ کا ارشاد ہے کہ یہ لوگ اللہ کے کلام کو بدلنا چاہتے ہیں (بخاری)

قرآن کے الفاظ کو بدلنا تو ممکن نہیں تھا کہ (دیگر آسمانی کتابوں کے برعکس) اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے اٹھا رکھا ہے اور یہ ایسے دور میں نازل کیا گیا جب اسے ضبطِ تحریر میں لایا جا سکتا تھا۔ لہذا جو لوگ قرآن کو بدلنا چاہتے تھے انہوں نے یہ کیا کہ قرآن کو ضعیف و وضعی روایات کے ذریعے سمجھنے اور سمجھانے کا رواج ڈال دیا۔ مختلف آیات کی شانِ نزول میں مختلف روایات لکھ دی گئیں کہ فلاں واقعہ ہوا تو فلاں آیت نازل ہوئی۔ اس طرح قرآنی آیات کا مفہوم انکے الفاظ کے بجائے ان واقعات سے اخذ کیا گیا جو وضعی روایات کے مطابق قرآنی آیات کے نزول کی وجہ ہیں۔ پھر لعنت کے بجائے اسی خود ساختہ مفہوم کے مطابق قرآنی الفاظ کے معانی متعین کیے گئے، اور پھر ان معانی کو ''شرعی معانی'' کا نام دے کر یہ کہہ دیا گیا کہ ''شرعی معانی'' ''لغوی معانی'' پر مقدم ہوتے ہیں، اور اس طرح قرآن کو ''مہجور'' بنا دیا گیا۔

علامہ اقبال کے بقول

قرآن کو بازیچہء تاویل بنا کر
چاہیں تو خود اک تازہ شریعت کریں ایجاد

قرآن کہتا ہے کہ

ان لوگوں کے لیے ہلاکت اور تباہی ہے جو اپنی طرف سے شریعت کے احکام لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ (احکام) خدا کی طرف سے ہیں تا کہ ان کے عوض تھوڑا سا فائدہ حاصل کر لیں۔ ان لوگوں نے اپنی طرف سے جو کچھ لکھا وہ بھی ان کے لیے تباہی کا سامان ہے اور اس کے عوض جو فائدہ حاصل کیا وہ بھی موجبِ ہلاکت ہے (79/البقرۃ)

مثال کے طور پر ایک آیت کا یہ مشہور ٹکڑا دیکھیے کہ

''الرجال قوامون علی النساء'' (34/النساء)

اسکے ساتھ ہوا یہ کہ پہلے اس کی شانِ نزول میں اس قسم کی خلافِ قرآن روایات لکھ دی گئیں کہ

''حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ (اسکا) مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو مردوں کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک عورت نے رسول اللہؐ کے سامنے اپنے خاوند کی شکایت کی کہ اس نے مجھے تھپڑ مارا ہے۔ اس پر آپؐ نے بدلہ لینے کا حکم دیا ہی تھا جو یہ آیت اتری اور بدلہ نہ دلوایا گیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک انصاری اپنی بیوی صاحبہ کو لئے ہوئے حاضر خدمت ہوئے۔ اس عورت نے حضورؐ سے کہا کہ یا رسول اللہؐ میرے خاوند نے مجھے تھپڑ مارا ہے جسکا نشان اب تک میرے چہرے پر موجود ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اسے (اسکا) حق نہ تھا۔ وہیں یہ آیت اتری کہ ادب سکھانے کیلئے مرد عورتوں پر حاکم ہیں'۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے کچھ اور چاہا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اور چاہا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ اگر میں کسی کو حکم کر سکتا کہ ماسوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے'' (تفسیر ابن کثیر)۔

پھر ان تفسیری روایات کی بنیاد پر زیر بحث آیت کے ٹکڑے کا ترجمہ یوں کیا گیا کہ ''مرد عورتوں پر حاکم ہیں''۔ اور پھر اس خود ساختہ ترجمے کی رو سے ''قوامون'' کے

معانی ''حاکم'' متعین کر دیئے گئے۔ جبکہ لغت (تاج العروس، لسان العرب وغیرہ) کی رو سے ''قوامون'' کے معانی ہیں ''کفالت کرنے والے۔ یعنی ضروریات زندگی پوری کرنے والے'' (صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ قرآنی تقسیم کار کے تحت مرد عورتوں کے کفیل ہیں۔ تفصیل ''کیا عورت مرد سے کم تر ہے'' میں لکھ دی گئی ہے)۔

حضرت علامہ اقبالؒ نے کیا خوب فرمایا کہ

احکام ترے حق ہیں مگر تیرے مفسر
تاویل سے قرآن کو بنا سکتے ہیں پازند

آپ نے دیکھا کہ کس صفائی کے ساتھ قرآنی آیات کا مفہوم اپنے مفادات کے تحت تبدیل کر لیا گیا۔ انہی تبدیلیوں کی وجہ سے دیکھنے والوں کو قرآن میں تضاد دکھائی دیتا ہے۔

آپ خود ہی سوچیے کہ کیا زیرِ بحث ترجمے کو درست تسلیم کیا جا سکتا ہے جبکہ قرآنِ کریم کے مطابق

(کوئی اور تو دور کی بات) کسی نبی کو بھی کسی دوسرے انسان پر حکومت کا حق حاصل نہیں (79/ال عمران) محکومیت و اطاعت صرف خدا کی جائز ہے کیونکہ ''خدا سب کا تنہا حاکم ہے'' (108/الانبیا) خدا کے سوا کسی کی محکومیت و اطاعت جائز نہیں کیونکہ ''خدا اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا'' (26/الکھف) اور خدا کی محکومیت اختیار کرنے کا مطلب اس دستورِ حیات کی اطاعت اختیار کرنا ہے جو قرآن میں محفوظ ہے، کسی دوسری آسمانی کتاب میں محفوظ نہیں (152,156/الانعام) حضور اکرمؐ نے بھی کتاب اللہ ہی کی محکومیت و اطاعت کی (50/الانعام، 15/یونس، 203/

الاعراف)اور باقی انسانوں کو بھی قرآن کی محکومیت و اطاعت کرنی چاہیے(55/الزمر،3/الاعراف)

روایت زدہ تراجم وتفاسیر سے نام نہاد مسلمانوں نے اسلام کو اتنا نقصان پہنچایا کہ جتنا کافروں نے بھی نہیں پہنچایا، اور ضعیف ووضعی روایات کے ذریعے اللہ تعالی، قرآن کریم، نبی اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ، کی شان میں ایسی ایسی گستاخیاں کی گئیں اور کی جارہی ہیں کہ جنکے بارے میں سوچ کر بھی گردن شرم سے جھک جاتی ہے۔

مثال کے طور پر یہ آیات دیکھئے کہ

''ہم اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور پچھلوں کو بھی جانتے ہیں۔ اور تیرا رب انہیں اکھٹا کرے گا۔ وہ حکیم وعلیم ہے''(24,25/الحجر)۔

ان آیات کا قطعی غیر مبہم مفہوم یہ ہے کہ ''خدا قیامت میں تمام انسانوں کو جمع کرے گا کہ وہ انہیں بھی جانتا ہے جو گزر چکے ہیں اور انہیں بھی جانتا ہے جو گزرنے والے ہیں۔ وہ حکمت والا ہے۔ وہ علم والا ہے''۔ اور اس مفہوم کی تصدیق ان واضح آیات سے بھی ہوتی ہے کہ

''کہہ دو کہ بے شک پہلے اور پچھلے سب ایک معینہ روز کی معیاد پر ضرور جمع کیے جائیں گے''(50,51/الواقعۃ)۔

اب ان آیات کی روایت زدہ تفسیر سنیے اور غور سے سنیے۔ جامع ترمذی میں حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ

ایک حسین عورت رسول اللہؐ کے پیچھے نماز پڑھنے آیا کرتی تھی۔ صحابہؓ میں سے کچھ لوگ تو آگے کی صف میں بڑھ جاتے تھے تا کہ اسے نہ دیکھیں۔ لیکن کچھ لوگ پیچھے کی صف میں شریک ہوتے تھے اور رکوع

کی حالت میں بغل کے نیچے کی طرف سے اُسے جھانکتے رہتے تھے۔
اس پر یہ آیت اُتری کہ ہم تم میں سے اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور پچھلوں کو بھی''۔

ایک اور مثال اس آیت کی دیکھیے کہ

''اے ایمان والو ان پاکیزہ چیزوں کو جنہیں اللہ نے تمھارے لئے حلال قرار دیا ہے حرام نہ ٹھہراؤ'' (87/المائدہ)

سیدھی سی بات ہے کہ دین کو خود ساختہ پابندیوں میں قید کرنے کے بجائے ان حدود و قیود کا خیال رکھو جو خدا نے خود قرآن میں مقرر کر رکھی ہیں۔اب دیکھیے اس آیت کی روایت زدہ تفسیر

''عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ ہم رسولؐ اللہ کے ہمراہ جہاد میں شریک تھے اور ہمارے ساتھ عورتیں نہیں تھیں۔(اور عورتوں سے جدائی برداشت نہیں ہوتی تھی بوجہ قوت و حرارت کے) تو ہم نے عرض کیا کہ آیا خصی ہو جائیں۔آپؐ نے منع فرمایا اور پھر اجازت دے دی کہ عورت سے تھوڑے یا زیادہ دن مقرر کر کے جس میں عورت راضی ہو نکاح کر لو (تا کہ اس فعل یعنی خصّی ہونے سے بچو) اور نگاہِ بد کسی پر نہ پڑے اور پھر یہ آیت پڑی'' (بخاری/ کتاب التفسیر)

ایک اور روایت یہ ہے کہ

''سلمہ بن اکوع رسولؐ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ جو مرد اور عورت آپس میں موافق ہو جائیں تو تین شب تک باہمی

عشرت کرنا جائز ہے۔ پھر اگر وہ زیادہ رہنا چاہیں اور کم تو وہ مختار ہیں'' (بخاری/ کتاب النکاح)

ایک اور مثال دیکھیے کہ

''حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ میرا باپ کون ہے؟ فرمایا تیرا باپ فلاں شخص ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ 'مسلمانو ایسی باتیں نہ پوچھا کرو کہ وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں تو بری لگیں'' (مسلم)

اس طرح کی بے شمار وضعی روایات، حدیث کی مستند ترین کتب میں بھی موجود ہیں جو بذاتِ خود (چیخ چیخ کر) کہہ رہی ہیں کہ انہیں اسلام کے دشمنوں نے اپنی خواہشات اور جذبات کے تحت مرتب کر کے حضورؐ اور صحابہ کرامؓ سے منسوب کیا ہے۔ لیکن اندھی تقلید کی ماری ہوئی مسلمانوں کی اکثریت سوچے سمجھے بغیر ان رسومات کو بھی اپنے ایمان کا لازمی حصہ قرار دیتی ہے۔

ایک اور بڑی واضح مثال ملاحظہ فرمائیے کہ سورۃ یوسف کے مطابق حضرت یوسف کی بتائی ہوئی خواب کی تعبیر سے متاثر ہو کر بادشاہ نے انہیں قید سے رہا کرنے کا حکم صادر کیا۔ لیکن حضرت یوسفؑ کی غیرت نے شاہانہ بخشش کے طور پر ملنے والی اس رہائی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ پہلے اس جھوٹے الزام کی تحقیقات کروائی جائیں جس کی پاداش میں انہیں قید کیا گیا۔ جب یہ ثابت ہو جائے کہ وہ الزام جھوٹا ہے تو ہی وہ رہائی قبول کریں گے۔

اب اس غیرتِ یوسفی کی تفسیر میں لکھی ہوئی ایک روایت ملاحظہ فرمائیے کہ

''حضورِ اکرمؐ نے فرمایا کہ جتنے دنوں یوسفؑ قید میں رہے، اگر میں

ہوتا تو رہائی کے حکم کو ضرور قبول کر لیتا'' (بخاری/ کتاب التفسیر)

صاف ظاہر ہے کہ یہ روایت کسی یہودی کی وضع کردہ ہے تا کہ اس کے ذریعے یہ ثابت کیا جا سکے کہ حضورؐ کے مقابلے میں حضرت یوسفؑ کا کردار زیادہ پختہ اور بلند تھا۔ آپ خود ہی سوچیے کہ کیا اس قسم کی روایات کو کسی صورت میں بھی حضورِ اکرمؐ یا صحابہؓ سے منسوب کیا جا سکتا ہے؟

بہر طور اس قسم کی وضعی روایات کی روشنی میں بڑے بڑے جید و ممتاز علمائے دین نے قرآنی آیات کو عملی زندگی میں استعمال کرنے کے جو طریقے وضع کیے، ان کے کچھ نمونے بھی ملاحظہ فرمالیجئے کہ ان سے قرآن کے دُکھ کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔

لکھتے ہیں کہ

.... ''پوری سورۃ نوح سوتے وقت پڑھ لی جائے تو احتلام سے محفوظ رہے گا''۔

....اس آیت یٰا یُّھا النَّاسُ اتقُوْ رَبَّکُمْ اِنَّ زَلْزَلَۃَ السَّاعَۃِ شَیْئٌ عَظِیْم (یعنی اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو۔ یقیناً قیامت کا زلزلہ ایک عظیم شے ہے) کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ ''حفظِ حمل کے لئے مفید ہے''۔

....اَلْمُغْنِی (سب سے بے نیاز اور سب کا حاجت روا) کے بارے میں فرماتے ہیں ''اگر مشغولِ جماع کے وقت خیال سے پڑھے تو بیوی اس سے محبت کرنے لگے۔

....اور اَلرَّحْمٰن الرَّحِیم کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''اگر طالب و مطلوب کا نام معہ نام والدہ کے لکھے، اس کی محبت میں سرگرداں ہو۔

بشرطیکہ جائز محبت ہو''۔

یہ اور اس قسم کے کئی اور اقوال 'اعمال قرآنی'' کے نام سے مرتب کر کے شائع کیے گئے ہیں۔ مرتب کرنے والے نے ایک کارنامہ اپنی طرف سے بھی تحریر کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ

''احقر کو حضرت مرشدی..... نے ارشاد فرمایا تھا کہ اگر کوئی حاجت مند تعویذ وغیرہ لینے آوے تو انکار مت کرو۔ چنانچہ احقر کا معمول ہے کہ اس حاجت کے مناسب کوئی آیت قرآنی یا کوئی اسم الٰہی سوچ کر لکھ دیتا ہے اور بفضل تعالیٰ اس میں برکت ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک بی بی کی مانگ باوجود کوشش بار بار کے سیدھی نہیں نکلتی تھی۔ احقر نے کہا اِھد نا الصراط المستقیم پڑھ کر مانگ نکالو۔ چنانچہ اس کا پڑھنا تھا کہ مانگ بے تکلف سیدھی نکل آئی۔ احقر نے یہ حکایت اس لئے عرض کی ہے کہ کوئی اور طالب بھی اس معمول کو اختیار کرے تو امیدِ نفع و برکت ہے''۔

ایسی ہی ایک اور کتاب ''عطا المنان'' (کے ترجمہ) میں درج قرآنی آیات کے کچھ اور فضائل بھی دیکھ لیجئے جنہیں بڑے بڑے بزرگان دین کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

''-بکری کا دایاں بازو گوشت کا سالم دست لے۔ بعد نماز جمعہ تنہا مکان میں ننگا مادر زاد ہو کر دست پر سورہ یسین معہ نام طالب و مطلوب کے جس قدر لکھی جا سکے لکھے۔ پھر ایک ہانڈی میں رکھ کر چولہے کے نیچے دفن کر دے کہ گرم رہے اور جلے نہیں۔ مطلوب کا دل طالب کے عشق میں بے قرار ہوگا۔ اگر جل جائے گا تو طالب کو سوزش ہوگی۔ احتیاط شرط ہے۔ عمل مجرب ہے۔

-منقول از امام غزالیؒ۔الف سے طا تک حروف مفردات ابجد ایک روٹی پر لکھے اور اس پر سورہ رعد پڑھے۔ پھر اس کے پانچ ٹکڑے کر کے پانچ کتوں کو کھلائے۔کھلاتے وقت کہے۔کھاؤ گوشت فلاں بن فلاں کا اور اس کے اعضاء چباڈالو۔اللہ کے حکم سے دشمن کے جسم میں بڑے بڑے پھوڑے نکلیں گے اور اس کا بدن پھوٹ نکلے گا۔

-ایک عمل چہل کاف کے متعلق درج ہے جس کی نسبت تحریر ہے کہ یہ عمل بالاتفاق سب کے نزدیک الہامی ہے اور منسوب ہے حضرت غوث الاعظم میراں محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی طرف۔ **الحمد لله اولاً وَ اٰخِراً** اس عمل کی متعدد خاصیتیں درج ہیں۔ منجملہ ایک یہ بھی ہے کہ درازی ءعمر کے لئے سات سات دن کے بعد سات مرتبہ کنگھی پر دم کر کے داڑھی میں کرے''۔

غور کیجئے کہ وہ قرآن جس کے ذریعے فخر انسانیت، رحمت عالم، نبی آخرالزماں حضور اکرمؐ نے دنیا میں فہم وفکر، علم وبصیرت اور تعمیر وترقی کا ایک بے مثل انقلاب برپا کیا، اسی قرآن کے ساتھ آپؐ کے امتی کیا سلوک کر رہے ہیں؟

حضرت علامہ اقبالؒ کے بقول

اسی قرآن میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

....

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

کیا آپ نہیں جانتے کہ قرآن تمام نوعِ انسانی کے ابدی دستورِ حیات کی حیثیت سے نازل کیا گیا۔یعنی قرآن کی تعلیم ہر کسی کے لیے بھی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھی۔تو آپ خود ہی سوچیے کہ قرآنِ کریم کے ساتھ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اس کی کسی آیت کو کسی خاص واقعہ یا وقت کے ساتھ منسوب ومخصوص کیا جائے؟ کیا قرآنی تفہیم کا یہ طریقہء کار،قرآنی احکام کے دائرہ ءکار کو محدود کرنے کے مترادف نہیں؟

روایات کی رو سے قرآن کا مفہوم متعین کرنا یوں بھی غیر قرآنی فعل معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے قرآن کو ''نور'' کہا ہے(52/الشوری،35/النور وغیرہ) تو جس طرح ''روشنی کو اپنا آپ دکھانے کیلئے کسی خارجی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی اسی طرح قرآن بھی تصریفِ آیات کے ذریعے اپنا مفہوم خود واضح کر دیتا ہے(105/الانعام)۔ لیکن جس طرح روشنی کو وہی لوگ دیکھ سکتے ہیں جنکی آنکھیں کھلی ہوں اسی طرح قرآن کو بھی ''اولی الالباب'' یعنی عقل وفکر سے کام لینے والے لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں (18/الزمر، 10/ الطلاق)۔قرآن ہی کے بقول

''قرآن ایک ایسی کتاب ہے جسکی آیات الگ الگ کر کے نکھار کر بیان کی گئی ہیں (اسطرح) یہ قرآن صاف اور واضح (ہو گیا ہے) ان لوگوں کیلئے جو علم وبصیرت رکھتے ہیں''(3/حم السجدۃ)۔

آیئے اب یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن کی رو سے قرآن فہمی کا طریقہ کیا ہے؟ قرآن کی کسی آیت کا مفہوم سمجھتے ہوئے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ قرآن کی مجموعی تعلیم کا تصور ہر وقت ذہن میں رہے۔یعنی کسی ایک آیت کے مفہوم اور قرآن کے مجموعی مفہوم

میں اختلاف نہیں ہونا چاہیے کیونکہ قرآن ہی کے بقول ''قرآن میں کوئی تضاد نہیں (82/النساء) اسکے علاوہ تین باتوں پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

پہلی بات یہ کہ قرآنی الفاظ کا مادہ دیکھ کر عربی لغت کی رو سے اسکے بنیادی معانی دیکھے جائیں۔ کیونکہ قرآن کے بقول قرآن کو عربی زبان میں نازل کیا گیا (12/ الاحقاف، 3/الزخزف، 7/الشوری، 113/طہ وغیرہ) ایسی عربی جو بات کو کھول کھول کر بیان کر دیتی ہے (195/الشعراء) ایسی عربی جس میں کوئی پیچ وخم نہیں (28/الزمر) یہی وجہ ہے کہ قرآن میں نہ کوئی کجی ہے نہ پیچیدگی (1/الکھف)۔ دوسری بات یہ دیکھی جائے کہ صحرا کے رہنے والے عرب ان الفاظ کو کس کس انداز سے استعمال کرتے ہیں یعنی انکے یہاں کسی خاص لفظ کے مادہ (root) کے بارے میں کیا تصور رائج تھا۔ کیونکہ قرآن نازل ہی اس صاف ستھری اور واضح زبان میں ہوا جو صحراؤں کے رہنے والے سیدھے سادے عربوں میں بولی جاتی تھی۔ قرآن کے بقول ''اے محمدؐ ہم نے قرآن کو تیری زبان میں آسان کر دیا ہے تاکہ لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں'' (58/الدخان)۔ اور تیسری بات یہ دیکھی جائے کہ کوئی خاص لفظ قرآن میں کہاں کہاں اور کن کن معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ قرآن کے بقول خدا قرآنی آیات کو پھیر پھیر کر اور دہرا دہرا کر انکی وضاحت کرتا ہے (105/الانعام) اسی کو تصریفِ آیات کہتے ہیں۔

قرآن فہمی کے ان مراحل کو اب ایک مثال سے اور اس مشہور آیت کا قرآنی مفہوم معلوم کرتے ہیں کہ ''اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے'' (153/البقرۃ، 66/ الانفال)۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھتے ہیں کہ کیا اس آیت کا مروجہ مفہوم قرآن کی مجموعی تعلیم سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟ مروجہ مفہوم کی رو سے ''صبر'' نام ہے خاموشی سے ظلم وزیادتی سہنے کا اور ظاہر ہے کہ اس سے ظلم وزیادتی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ جبکہ قرآنی تعلیم کے

مطابق ظلم وزیادتی کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکنا مومنین کا اولین فریضہ ہے چاہے اس میں ان کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے (تفصیل ''صبر'' کے عنوان میں لکھ دی گئی ہے)۔یعنی صبر کا مروجہ مفہوم قرآن کے مجموعی مفہوم کے خلاف ہے۔

اب یہ دیکھتے ہیں کہ ''صبر'' کے بنیادی معانی کیا ہیں۔صبر کا مادہ (ص۔ب۔ر) ہے اور اسکے لغوی معنی ہیں ''کسی شخص کا کسی مطلوبہ شے کے حصول کیلئے برابر معروف کار رہنا۔(تاج العروس) لہذا صبر کے بنیادی معنی ہیں 'مسلسل جدوجہد اور ثابت قدمی'۔

اب یہ معلوم کرتے ہیں کہ صحرانشین عربوں کے ہاں اس مادہ کا کیا مفہوم رائج تھا۔لغت کی رو سے چوبیس گھنٹے ایک جگہ کھڑے رہنے والے بادل کو بھی ''الصبیر'' کہا جاتا تھا اور پہاڑ کو بھی ''الصبیر'' ہی کہتے تھے۔(تاج العروس۔لغات القرآن) جس سے صاف ظاہر ہے کہ صحرانشین عروبوں کے ہاں صبر کا مفہوم مسلسل جدوجہد اور ثابت قدمی تھا۔

اور آخر میں یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن میں ''صبر'' کو کس طرح استعمال کیا گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ

> ''صابرین وہ لوگ ہیں جو خدا کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کی وجہ سے نہ ہمت ہارتے ہیں نہ بزدلی دکھاتے ہیں اور نہ ہی باطل کے آگے جھکتے ہیں'' (146/ال عمران)

ظاہر ہے کہ یہاں صبر کرنے والے مجاہدین سے مراد ڈٹ کر مقابلہ کرنے والے مجاہدین ہی ہوسکتا ہے۔آپ نے دیکھا کہ قرآن فہمی کے جملہ مراحل سے گزر کر زیر بحث آیت کا مفہوم کس طرح واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے کہ ''اللہ ثابت قدمی سے مسلسل جدو جہد کرنے والوں کے ساتھ ہے'' اور یہ مفہوم قرآن کے مجموعی مفہوم کے عین مطابق ہے۔

کاش مسلمان قرآن کو روایات کی روشنی میں سمجھنے کے بجائے قرآن کی روشنی میں

سمجھنا شروع کر دیں تا کہ انکی نگاہ ایک بار پھر بلند، فکر ایک بار پھر کشادہ اور بصیرت ایک بار پھر گہری ہو جائے اور وہ تخریب و تنزلی کے دلدل سے نکل کر تعمیر و ترقی کی وادیوں میں ایک بار پھر امن و محبت کے ایسے چراغ روشن کر دیں کہ جن سے ساری دنیا کی تاریکی دور ہو جائے۔